سلسلۂ مطبوعات مجلس
۱۲۹

برخود نظر کشا ز تہی دامنی مرنج
در سینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند
(اقبال)

......پا جا سُراغِ زندگی

طلبائے علوم نبوت کا منصب و مقام
ملت کی ان سے توقعات، عصر حاضر میں
ان کی ذمہ داریاں

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ

۱۰ واں ایڈیشن

۱۴۳۱ھ ——— ۲۰۱۰ء

کتابت ——— ظہیر احمد کاکوروی
صفحات ——— ۲۰۰
طباعت ——— کاکوری آفسٹ پریس لکھنؤ
قیمت ———
تعداد ——— ایک ہزار (۱۰۰۰)

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام
پوسٹ باکس ۱۱۹ لکھنؤ

فون : 91522-2741539 موبائل : 09335223411
فیکس : 91522-2740806

پا جا سراغ زندگی

وَجَعَلْنَا هُمْ أَئِمَّةً يَهْدُوْنَ بِأَمْرِنَا

لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ○

سورۂ سجدہ، آیت-۲۴

فہرست عناوین
"پا جا سُراغ زندگی"

مدرسہ کیا ہے؟ ۲۰۰-۱۷۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین محمد وآلہ

وصحبہ اجمعین

زیرِ نظر مجموعہ عم مخدوم ومعظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کی ان تقریروں پر مشتمل ہے، جو مولانا نے طلبائے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سامنے مختلف مواقع پر اور اکثر تعلیمی سال کے آغاز پر کیں، ان تقریروں کا (جو اکثر زبان دل سے کی گئیں اور امید ہے کہ گوش دل سے سنی گئی ہوں گی) مرکزی خیال اور بنیادی موضوع ایک ہی تھا، اور وہ یہ کہ ایک طالب علم کی نگاہ کن بلند مقاصد پر رہنی چاہئے، اور اپنے محدود ومخصوص ماحول میں رہ کر بھی وہ کیا کچھ بن سکتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جو جوہر کمال اس کے اندر ودیعت فرمایا ہے، اس کو ترقی دے کر اور چمکا کر وہ کن علمی وروحانی بلندیوں پر اپنا نشیمن بنا سکتا ہے۔

مولانا مدظلہٗ نے یہ تقریریں جس درد وسوز سے کیں اور اپنے طویل علم ومطالعہ اور تجربہ ومشاہدہ کا نچوڑ جس طرح پیش کیا وہ کتاب کی سطر سطر سے نمایاں ہے:۔

"ہے رگ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو"

عالم اسلام کے زوال وانتشار کے موقع پر علماء اسلام کی ذمہ داری کے احساس، ان کی

کوتاہی اور تقصیر پر قلبی اذیت نیز ندوۃ العلماء کے وسیع و جامع تخیل کی نزاکت و اہمیت نے شاید ان کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ اپنا سارا علمی اثاثہ اور اندوختہ بے تکلف و مخلصانہ طریقہ پر اپنے عزیز طلبہ کے سامنے رکھ دیں، اور جن نتائج تک وہ طویل علمی رہ نوردی اور تحقیق و جستجو کے بعد پہونچے تھے اس کا ماحصل اور خلاصہ ان کے سامنے بیان کر دیں۔

یہ تقریریں ابھی انشاء اللہ آپ کی نظر سے گذریں گی لیکن ان کے اصل تاثر اور کیف اور مقرر کے درد و سوز (جو وقت اور مجلس کا پابند ہے اور بعد میں قلمبند کرنے سے پورا باقی نہیں رہتا) کا کچھ اندازہ آپ اقبال کے ان اشعار سے کر سکتے ہیں جو ان کی مشہور نظم "ساقی نامہ" میں درج ہیں۔

شراب کہن پھر پلا ساقیا — وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا — مری خاک جگنو بنا کر اڑا
خرد کی غلامی سے آزاد کر — جوانوں کو پیروں کا استاد کر
ہری شاخ ملت ترے نم سے ہے — نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے — دل مرتضیٰؓ سوز صدیقؓ دے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر — تمنا کو سینوں میں بیدار کر
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر — زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوز جگر بخش دے — مرا عشق میری نظر بخش دے

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں — مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز — مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری آرزوئیں مری — امیدیں مری جستجوئیں مری

مری فطرت آئینۂ روزگار عزالانِ افکار کا مرغ زار

مرا دل مری رزم گاہِ حیات گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لٹا دے اسے

لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

ہمارے ان طلبہ کو جو ابھی اس ریاضِ علم میں مصروفِ گل چینی اور محوِ چمن آرائی ہیں، ان تقریروں سے یہ اندازہ ہوگا کہ ان سے کیسی کیسی توقعات قائم کی جارہی ہیں، اور کن عظیم ذمہ داریوں کا ان کو اہل سمجھا گیا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس سے ان کے اندر یہ داعیہ پیدا ہو کہ وہ کچھ حاصل کر کے یہاں سے واپس جائیں اور اسلام اور علماءِ اسلام کا نام دنیا میں روشن کریں۔

مدرسہ کی اور مدرسہ کے طالب علم کی ذمہ داری، موجودہ دور میں اس کا کردار، دنیا کے نقشہ میں اس کی حیثیت، انسانیت کے لئے اس کی مسیحائی و جاں نوازی اور اس کے عظیم علمی و دعوتی مقاصد اور فوائد کی اہمیت کو سمجھے بغیر ہم ان توقعات کا پورا اندازہ نہیں کر سکتے جو ملت نے ان طالبانِ علوم نبوت سے قائم کی ہیں، ہم یہاں اس سلسلہ میں خود مولانا کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں، جو مدرسہ کا سب سے شاندار اور جاندار تعارف بلکہ شاید سب سے بڑا خراج ہے، جو اس کو اس زمانہ میں پیش کیا گیا ہے۔

"میں مدرسہ کو ہر ادارہ سے بڑھ کر مستحکم، طاقت ور، زندگی کی صلاحیت رکھنے والا اور حرکت و نمو سے لبریز سمجھتا ہوں، اس کا ایک سرا نبوت محمدی سے ملا ہوا ہے، دوسرا اس زندگی سے، وہ نبوت محمدی کے چشمۂ حیواں سے پانی لیتا ہے، اور زندگی کی ان کشت زاروں میں ڈالتا ہے، وہ اپنا کام چھوڑ دے تو زندگی کے کھیت سوکھ جائیں، اور انسانیت مرجھانے لگے، نہ نبوت محمدی

کا دریا پایاب ہونے والا ہے، نہ انسانیت کی پیاس بجھنے والی ہے، نہ نبوت محمدی کے چشمۂ فیض سے بخل اور انکار ہے، نہ انسانیت کے کاسۂ گدائی کی طرف سے استغنا کا اظہار، اُدھر سے "إِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ يُعْطِي" کی صدائے مکرر ہے، تو اِدھر سے "هَلْ مِنْ مَّزِيْد" کی فغانِ مسلسل۔

مدرسہ سے بڑھ کر دنیا میں کون سا زندہ متحرک اور مصروف ادارہ ہو سکتا ہے، زندگی کے مسائل بے شمار، زندگی کے تغیرات بے شمار، زندگی کی ضرورتیں بے شمار، زندگی کی لغزشیں بے شمار، زندگی کے فریب بے شمار، زندگی کے رہزن بے شمار، زندگی کی تمنائیں بے شمار، زندگی کے حوصلے بے شمار، مدرسہ نے جب زندگی کی رہنمائی اور دستگیری کا ذمہ لیا تو اسے اب فرصت کہاں؟ — دنیا میں ہر ادارہ، ہر مرکز، ہر فرد کو راحت اور فراغت کا حق ہے، اس کو اپنے کام سے چھٹی مل سکتی ہے، مگر مدرسہ کو چھٹی نہیں، دنیا میں ہر مسافر کے لئے آرام ہے، لیکن اس مسافر کے لئے راحت حرام ہے۔"[1]

اگر اس احساس و شعور کے ساتھ ہم یہ کتاب شروع کریں گے تو اس وقت حصول کمال انبیاءؑ واختصاص اور صدق و اخلاص کی وہ دعوت ہماری سمجھ میں اچھی طرح آجائے گی جو کتاب میں بڑی بلند آہنگی، بڑی دل سوزی و دردمندی اور بہت شرح صدر اور یقین کے ساتھ دی گئی ہے۔

مغربیت و لادینیت کے عالم گیر سیلاب میں عربی مدارس کے طلبہ کی ذمہ داری بالعموم اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے فرزندوں کی بالخصوص آج پہلے سے بہت زیادہ ہے، ندوہ کی اس لئے کچھ زیادہ ہے کہ علوم دینیہ و علوم عصریہ کی جامعیت، جدید اسلحہ سے لیس ہونے اور علمی و ادبی میدان میں اپنے حریفوں سے فائق و برتر ہونے کی دعوت ابتدا سے اس کی بنیاد میں شامل، بلکہ اس کے تخیل اور نصب العین کی اساس ہے۔

آج اپنے خیالی جزیروں میں پناہ لے کر یا ساحل کے خاموش تماشائی بن کر ہم علم و ادب

---

[1] "طالبان علوم نبوت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں۔"

اور سیاست وقوت کی دنیا میں کوئی دیرپا نقش ہرگز قائم نہیں کرسکتے، اس کے لئے بڑی زندگی اور زندہ دلی، بڑے ایمان ولقین، بڑے اخلاق وکردار، بڑے علمی رسوخ اورامتیاز اور بڑی کاوش اور ریاض کی ضرورت ہے، اور یہ مقدس فرض وہی خوش نصیب وباہمت نوجوان انجام دے سکتے ہیں، جن کے سینوں میں علوم نبوت کا نور، جن کے دلوں میں حالات کو بدلنے کا عزم وحوصلہ، جن کی رگوں میں زندگی کا ابلتا ہوا نیا خون، جن کے قدموں میں فاتح کا اعتماد وسرخوشی، جن کی آنکھوں میں عزم ولقین کی روشنی اور جن کی دمکتی ہوئی پیشانیوں پر ستارۂ اقبال وہوشمندی ہویدا ہو۔

آج کے بیمار اور مشکلات سے زار ونزار عالم اسلام کو اسی قسم کے نوجوانوں کی ضرورت ہے، اور اگر مدارس کے خوش نصیب طلبہ اس کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں، اور خلوص، طلب صادق اور حوصلہ مندی کے ساتھ اپنے علمی سفر کا آغاز کریں تو آج اس محدود ماحول، ناقص وسائل، کمزور صلاحیتوں اور قلت تعداد کے ساتھ ایسے محیر العقول واقعات، غیر معمولی نصرت، اور حیرت انگیز تبدیلیاں وجود میں آسکتی ہیں، اور علم وعمل اور ترقی واقبال کی ایسی شاہراہیں ان پر کشادہ ہوسکتی ہیں، جن کا تصور بھی ان کے لئے آج آسان نہیں۔

مقدمہ نگار کی خوش نصیبی ہے کہ اس کو ان تقریروں میں اکثر حاضری کا شرف حاصل ہوا، ان میں سے بیشتر تقریریں "تعمیر حیات" میں شائع ہوچکی ہیں، مجھے مسرت ہے کہ اب ذیلی عنوانات کے اضافہ اور مزید ترمیم وتصحیح کے بعد "پا جا سُراغ زندگی ـــــ" کے نام سے یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اس مجموعہ کی دو تقریریں دارالعلوم دیوبند میں کی گئی ہیں، ایک "طالبان علوم نبوت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں" کے عنوان سے ہے، یہ مقالہ دارالعلوم دیوبند میں طلبہ کے

ایک جلسہ میں مارچ ۱۹۵۴ء میں پڑھا گیا اور اس کا شمار مولانا کی موثر ترین تحریروں میں ہے، دوسری تقریر "عصر جدید کا چیلنج اور اس کا جواب" ہے، یہ تقریر بھی دارالعلوم دیوبند میں طلبہ کی خواہش اور فرمائش پر ایک بڑے اجتماع میں کی گئی جس میں طلبہ کے علاوہ اساتذہ اور دارالعلوم کے ذمہ دار بھی بڑی تعداد میں شریک تھے، آخری دو تقریریں وہ ہیں جو مولانا نے جامعہ رحمانی مونگیر، جامعہ ہدایت جے پور میں کیں، ان تقریروں کے اضافہ سے کتاب کی اہمیت و افادیت کہیں بڑھ گئی ہے۔

"انجمن طلبائے بھٹکل دارالعلوم ندوۃ العلماء" قابل مبارکباد ہے جس نے اتنے مفید مجموعہ کی اشاعت (پہلا ایڈیشن) کا اہتمام کیا، اس سے قبل یہ انجمن مولانا مدظلہ کا ایک رسالہ ...... "بارہ دن ریاست میسور میں" شائع کر چکی ہے، اس فعال انجمن کے جملہ اراکین خاص طور پر مولوی محمد فاروق بھٹکلی ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء) جو اس انجمن کے بانی بھی ہیں، شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بہت توجہ اور دلچسپی سے اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کی طباعت و اشاعت میں حصہ لیا، کتاب کا دوسرا ایڈیشن اب "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" کے زیر اہتمام شائع کیا جا رہا ہے۔

ان تقریروں کے تعارفی نوٹ میں اکثر طلباء کا درجات کے حوالہ کے ساتھ ذکر ہے، الحمد للہ یہ متعلم اب معلم بن چکے ہیں، اور اپنی جگہ دین و علم کی مفید خدمت انجام دے رہے ہیں۔

ان الفاظ کے ساتھ یہ مختصر لیکن بیش قیمت اور پر اثر کتاب نہ صرف دارالعلوم ندوۃ العلماء بلکہ تمام مدارس عربیہ کے طلبہ کے سامنے پیش کی جارہی ہے، کاش یہ ان کے حق میں صحیفۂ عزم و ہمت ثابت ہو اور وہ اپنی ان عظیم ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور اچھی طرح پورا کر سکیں۔

محمد الحسنی

۳۷ گوئن روڈ لکھنؤ

۱۱ رجمادی الثانی ۱۳۹۹ھ

۸ رمئی ۱۹۷۹ء

اخلاص، جذبۂ قربانی اور جوہر ذاتی

دار العلوم ندوۃ العلماء میں حسب روایت طلبہ کی الوداعی تقریب ۱۲ دسمبر ۱۹۶۳ء کو جمالیہ ہال میں منعقد ہوئی، جلسہ کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے ہوا، اس کے بعد فارغین میں سے مولوی معین الدین غازیپوری، مولوی نذر الحفیظ اور مولوی عبد السمیع جعفری نے اپنے جذبات کا اظہار کیا اور طلباء کے سامنے اپنے علمی سفر کی کچھ سرگذشت بیان کی۔

اس کے بعد مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ العالی نے طلباء کے سامنے الوداعی تقریر کی اور وہ صفات اور شرائط بیان کئے جن کے بغیر ان کے مقصد کی تکمیل ناممکن ہے اور جو ان کی زندگی کے لئے مشعل راہ اور زاد سفر بن سکتے ہیں، مولانا کی یہ تقریر اس قابل تھی کہ اسی وقت قلمبند کی جاتی اور اسی تفصیل و وضاحت اور قوت کے ساتھ درج کی جاتی، لیکن افسوس کہ اس وقت اس کا انتظام نہ ہو سکا، مولوی معین الدین غازیپوری نے جو خود بھی اس سال فارغ ہوئے تھے، اس کو بعد میں اختصار کے ساتھ قلمبند کرنے کی کوشش کی اور اس میں بڑی حد تک کامیاب رہے، آخر میں غلام جیلانی صاحب نے طلبہ کی نمائندگی کرتے ہوئے اساتذۂ دار العلوم اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور عصرانہ کے بعد یہ تقریب ختم ہوئی۔

اخلاص، جذبۂ قربانی اور جوہرِ ذاتی

حمد و صلوٰۃ کے بعد!

میرے عزیز طلباء! ایسے موقعہ پر اگر آپ رنجیدہ ہیں تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، یہ موقع ہی ایسا ہے جو رنج و مسرت دونوں کا جامع ہے لیکن وہ ماں قابلِ مبارکباد نہیں، جو ہمیشہ اپنے بچوں کو سینے سے لگائے رہے، اور آنکھوں سے اوجھل کرنے کے لئے تیار نہ ہو، بلکہ اس کا ایک وقت مقرر ہے، اس وقت تک وہ بچے کی پرورش کرتی ہے پھر وہی ماں اس بچے کو اپنی آنکھوں سے اوجھل کر دیتی ہے، تاکہ وہ اس کی پیری کے لئے سہارا بن سکے، اسی طرح آپ نے ایک مدت یہاں گذاری، اس میں آپ کا ہم سے مانوس ہونا یا ہمیں آپ سے انس ہونا بالکل قدرتی چیز ہے، اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کے اندر انس پیدا کیا ہے لیکن انسانوں کے اندر یہ جوہر بہت زیادہ نمایاں ہے، صرف لسانیات ہی نہیں نفسیات کے بھی بعض بڑے بڑے ماہرین کا یہ کہنا ہے کہ انسان کا لفظ اسی انس سے مشتق ہے، اس موقع پر یقیناً ہمیں اس حیثیت سے تو رنج ہے کہ آپ ہم سے جدا ہو رہے ہیں، ہمارا آپ کا جو ایک ساتھ تھا، وہ چھوٹ رہا ہے لیکن دوسری حیثیت سے ہمیں یہ مسرت ہے کہ آپ نے اپنی تعلیمی مدت حسن و خوبی کے ساتھ پوری کر لی، آپ نے اس زمانے جبکہ حالات بالکل ہی مخالف ہیں، اور زمانے سے سکون و اطمینان رخصت ہو چکا ہے،

دین کی تعلیم حاصل کی اس حیثیت سے آپ قابل مبارکباد ہیں اور ہمیں اس پر دلی مسرت ہے۔

فراغت کا غلط تخیل

لیکن ایسے موقع پر جب "فارغ" کا لفظ آتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ اس کا مفہوم سمجھنے میں لوگ غلطی کریں، دار العلوم کو ایک ایسی تعلیمی مدت تو رکھنی ہی چاہئے تھی جس مدت کو آپ طے کرتے اور اس مرحلے سے فارغ ہوتے لیکن اس موقعہ پر جو اہم بات آپ سے کہنی ہے وہ یہ ہے کہ اگر آپ نے اس کا مفہوم یہ سمجھ لیا کہ ہم تعلیم سے فارغ ہو گئے، اب ہمیں تعلیم و تربیت کی کوئی ضرورت نہیں تو بلا کسی حجاب کے اور تردد کے میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ آپ نے کچھ بھی نہیں سیکھا اور آپ کا ادارہ اپنے مقصد میں بالکل ناکام ہے، اور ہم لوگ بالکل ناکام ہیں، لیکن جیسا کہ مجھے یقین ہے کہ آپ نے فارغ ہونے کا یہ مفہوم نہیں سمجھا ہے، بلکہ فارغ ہونے کا مفہوم آپ کے نزدیک بھی یہ ہے کہ آپ اس قابل ہو گئے کہ کتابوں کو ہاتھ لگا سکیں اور حسب ضرورت ان سے استفادہ کر سکیں، بلکہ یوں کہا جائے کہ آپ کو اب علم کے حاصل کرنے کی کنجی دے دی گئی تو زیادہ صحیح ہوگا، آپ اس کنجی کے ذریعہ ہر قفل کھول سکتے ہیں، اور علم کے خزانے اپنے پاس جمع کر سکتے ہیں، آپ اس کنجی کو جتنا ہی استعمال کریں اسی قدر وہ کام دیتی چلی جائے گی۔

ہر نصاب کی ایک خصوصیت ہوتی ہے، اگر وہ نصاب اپنے فارغ شدہ طلباء کے اندر اس احساس کو پیدا کر دے یعنی جہل کا اعتراف، شاید یہ لفظ بعض کانوں کو نامانوس معلوم ہو، لیکن مجھے اس لفظ پر اصرار ہے، جسے لوگ ذوق علمی سے تعبیر کرتے ہیں، اگر آپ کے اندر یہ احساس پیدا ہو گیا ہے تو آپ کامیاب اور قابل مبارکباد ہیں، اور میں آپ کے ادارے کو مبارکباد پیش کرتا ہوں، اس کے بعد اس مختصر وقت میں اپنے جانے والے بھائیوں کو میں صرف تین باتوں کی

طرف متوجہ کرتا ہوں۔

اخلاص

پہلی چیز اخلاص ہے آپ کسی بڑے سے بڑے بزرگ یا جس کا نام آپ دنیا میں روشن پاتے ہیں اگر آپ اس کی زندگی کا مطالعہ کریں گے تو اس کی زندگی کی تعمیر میں اخلاص کو ایک اہم عامل پائیں گے، آپ دیکھیں گے کہ اس کی ہر چیز کو اخلاص نے دوام بخشا ہے، آپ ملا نظام الدینؒ کو دیکھ لیجئے، جن کے درس نظامی کا سکہ صرف ہندوپاک ہی میں نہیں اقصائے عالم میں چل رہا ہے، اور جس کو باوجود کوششوں کے اپنی جگہ سے ہلایا بھی نہیں جاسکا، محض ان کی علمیت کی بنا پر ایسا نہیں ہوا بلکہ ان کے ساتھیوں اور ان کے معاصرین میں بہت سے ایسے اشخاص تھے، جو علم وفضل اور ذہانت وذکاوت میں اگر بڑھے ہوئے نہیں تو ان کے ہم پلہ ضرور رہے ہوں گے، لیکن کیا بات ہے کہ آج ملا نظام الدین تو زندہ جاوید ہیں، لیکن ان کے معاصرین کا تذکرہ اگر آتا ہے تو ان کے سلسلے ہی میں آتا ہے، اگر آپ غور کریں اور ان کی زندگی کا مطالعہ کریں تو اس کی پشت پر اخلاص کی وہ زبردست قوت کارفرما پائیں گے، جس نے ملا نظام الدین کو قیامت تک کے لئے زندہ جاوید بنا دیا، بات صرف اتنی تھی کہ انھوں نے پڑھنے کے بعد یہ محسوس کرلیا کہ انھوں نے کچھ بھی نہیں سیکھا ہے، اور انھوں نے اپنے زمانے کے ایک ایسے اُمّی شخص سے جو گوشۂ گمنامی میں اودھ کے ایک چھوٹے سے گمنام گاؤں "بانسہ" میں اخلاص کا سرمایہ لے کر پڑا ہوا تھا، اپنے آپ کو متعلق کرلیا، اگر ملا نظام الدین چاہتے تو بہت سے ایسے بھی خدا کے بندے ان کو مل سکتے تھے، جو اپنے وقت کے امام تصور کئے جاتے تھے لیکن ملا نظام الدین نے اپنے آپ کو ایک ایسے شخص کے سپرد کیا جس کی شہرت اگر ہوئی تو

ملا نظام الدین کے ذریعے سے ہوئی، بہر صورت اس کی اگر مثالیں دی جائیں تو سیکڑوں مثالیں ملیں گی۔

جذبۂ قربانی

دوسری بات جو ہمیں آپ سے کہنی ہے، وہ ایثار و قربانی ہے، ایثار و قربانی اور عزم یہ وہ طاقت ہے کہ اگر افراد میں ہوتی ہے، تو انھیں ثریا تک پہونچا دیتی ہے، اور اگر کسی ادارہ یا قوم کے اندر پیدا ہو جاتی ہے تو دنیا اس کے سامنے جھک جاتی ہے، اور اس کی بالادستی کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔

جوہر ذاتی

اس کے بعد جو تیسری بات ہے، وہ جوہر ذاتی ہے، انسان کا ذاتی جوہر اور اس کی قابلیت ہی وہ چیز ہے، جو ہر وقت اور ہر زمانے میں اس کی ترقی کا واحد ذریعہ ہے، اگر آپ نے ان تینوں چیزوں یعنی اخلاص، جذبۂ قربانی اور جوہر ذاتی کو حاصل کر لیا ہے، تو آپ کے لئے زمانہ بالکل نہیں بدلا ہے، اور ہر وقت آپ کے لئے چشم براہ ہے، لیکن ان صفات سے اگر کوئی خالی ہے تو وہ جہاں بھی جائے گا، اور جس جگہ کی بھی سند یا ڈگری اس کے پاس ہوگی، حالات کو بدلا ہوا اور اپنے مخالف پائے گا، پھر میں کہتا ہوں کہ اگر آپ نے یہ صفات اپنے اندر پیدا کر لیں تو آپ کے لئے عالمگیر کا زمانہ، نظام الملک طوسی کا زمانہ، اور امام غزالی، امام رازی، امام ابن قیم، اور امام ابن تیمیہ کا زمانہ آج بھی منتظر ہے، اور وہ آپ کے لئے واپس ہو سکتا ہے، یہ غلط ہے کہ زمانے میں کوئی جگہ خالی رہنی ہے،

کبھی زمانے میں ایسا نہیں ہوا کہ کوئی جگہ پہلے سے خالی ہو اور کسی کی منتظر ہو کہ جب وہ شخص فارغ ہو گا تو اس کو وہ جگہ مل جائے گی، زمانہ "بقائے اصلح" کا قائل ہے، وہ بہت ہی حساس اور نقاد ہے، وہ صالح کے بجائے اصلح اور نافع کے بجائے انفع کو ترجیح دیتا ہے، لہذا اگر آپ کے اندر یہ چیزیں ہیں تو پھر..... زمانہ آپ کا ہے' اور آپ کا منتظر ہے' زمانے کا شکوہ دراصل اپنی کمزوری چھپانے کی کوشش اور احساس کمتری کی علامت ہے' دنیا نہیں بدلی ہے ہم بدل گئے ہیں' زمانہ آج بھی وہی ہے' جو پہلے تھا، تبدیلی صرف ہمارے اندر پیدا ہوئی ہے۔

آخری بات

اگر ہمارے سامنے یہ تصور اور یہ خیال نہ ہوتا تو یقیناً ہمارے لئے اس زمانے میں قطعاً یہ جائز نہ تھا کہ ہم کسی ایک مسلمان بچے کو اس کے ماں باپ سے الگ کر کے ایسی تعلیم دلاتے جس کی دنیا میں بظاہر کوئی قیمت نہیں، لیکن یہی تین باتیں ہیں، اخلاص، جذبۂ قربانی اور جوہر ذاتی، جس کی وجہ سے ہم کو اس کا پورا پورا حق حاصل ہے' اور اس کا پورا پورا جواز بلکہ ضرورت ہے کہ صرف ایک دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی نہیں ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند' مظاہر العلوم سہارنپور' اور اس طرح کے جتنے بھی ادارے قائم ہیں' وہ قائم رہیں' اور ترقی کریں، ہمیں امید ہے کہ ہمارے وہ طلباء جو ہم سے رخصت ہو رہے ہیں' وہ اپنی آنے والی زندگی میں ان اصولوں کو اپنائیں گے' اور وہ طلباء جنھیں ابھی موقع حاصل ہے' اور وہ کچھ سال یہاں گذاریں گے' زیادہ

سے زیادہ ان اصولوں سے فائدہ اٹھائیں گے، اس کے ساتھ ہمیں اپنے رخصت ہونے والے بھائیوں سے یہ امید ہے کہ وہ اپنے دارالعلوم سے ہر حال میں تعلق رکھیں گے، اور اس کو اپنا نصب العین بنائیں گے۔

مدرسے کا مقصد

۱۲ مارچ ۱۹۶۴ء کو ندوہ کی وسیع مسجد میں طلبائے دارالعلوم کا اجتماع ہوا، ہر سال تعلیم کے آغاز پر طلبہ کا یہ اجتماع منعقد ہوتا ہے، اس مرتبہ طلبہ کی تعداد میں نمایاں اضافہ ایک خاص بات تھی، حمد و صلوٰۃ کے بعد مولانا نے یہ تقریر فرمائی، اور درجہ ہشتم کے طالب علم نعیم صدیقی اعظمی نے اس کو قلمبند کیا۔

مدرسے کا مقصد

نئے سال کے شروع میں آپ سے تعارف حاصل کرنا اور اپنے تجربات بیان کرنا ایک مناسب و برمحل بات ہے، آپ سے بات کرنا مشکل بھی ہے اور آسان بھی ظاہر بات ہے کہ باپ جب اپنے بیٹے سے اور ایک عزیز اپنے دوسرے عزیز سے بات چیت کرتا ہے تو نہ اس کے اندر کسی تصنع و بناوٹ کی ضرورت ہوتی ہے، نہ دقیق و ثقیل الفاظ کے استعمال کی، یہی میری باتوں کی بھی حیثیت ہے، جانی بوجھی باتیں، عمر بھر کے تجربے، راستہ کے نشیب و فراز، اس کی منزلیں، ان تمام باتوں کو آپ کے سامنے رکھنا، اس نوعیت کے اعتبار سے یہ بات بہت آسان ہے، اس میں مجھے زیادہ سوچنے سمجھنے کی ضرورت نہیں، اور میں کیا یہاں آپ کے اساتذہ میں سے جو کوئی بھی آپ سے بات کرے اسے زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ

"عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں"

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ آپ سے بات کرنا مشکل بھی ہے، اس لئے کہ میں آپ سے اتنی باتیں کرنا چاہتا ہوں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے شروع کروں اور کہاں ختم کروں، باتوں کا ایک اتھاہ سمندر ہے، اور اس کے اتنے محرکات ہیں، جن میں سے کسی ایک کو نظر انداز کرنا مشکل ہے، لیکن ہر مشکل کا ایک حل ہے، اور اس کا حل یہ ہے کہ ان تمام باتوں کو مختلف اوقات

میں آپ کے سامنے رکھا جائے۔

سب سے پہلے میں آپ سب کو مبارک باد دیتا ہوں، پرانے طلبہ کو اس لئے کہ وہ اب تک موجود ہیں، زمانے کی گردشیں، اور اس کے الٹ پھیر نے الحمدللہ انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا، اور وہ اس کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے مقصد کے حصول میں مشغول ہیں، اور نئے طلبا کو مبارک باد اس لئے دیتا ہوں کہ انھوں نے دینی تعلیم کا انتخاب کیا، اللہ تعالےٰ کا کتنا فضل وکرم ہے کہ اس نے آپ کے والدین کو یہ توفیق دی کہ وہ آپ کو ایک دینی درسگاہ میں تعلیم کی غرض سے بھیجیں، بعض ایسے بھی طلبا ہیں، جو زبردستی بھیجے گئے ہیں، لیکن وہ بھی اللہ کے منظور نظر ہیں، حدیث شریف میں وارد ہے کہ جنت میں بعض لوگ ایسے بھی جائیں گے، جن کے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوں گی، یعنی وہ اللہ کے اتنے منظور نظر ہیں کہ باوجود اس کے کہ وہ خود جنت میں داخل ہونا نہیں چاہتے، ان کے بیڑیاں ڈال کر اور زبردستی داخل جنت کیا جائے گا، اسی طرح دینی تعلیم کا حصول بھی اتنی بڑی نعمت ہے کہ جو اس پر زبردستی لگائے جائیں، اور وہ بغیر اپنے مقصد کو سمجھے ہوئے جبراً و کرہاً یہاں پہونچائے جائیں، وہ بھی مبارک باد کے مستحق ہیں، غرض یہ کہ جو جس طرح بھی یہاں آیا وہ اور اس کے والدین لائق تحسین وصد مبارک باد ہیں۔

مگر یہاں آپ کو کیا ملے گا؟ آپ کیا پائیں گے؟ یہ بہت وسیع موضوع ہے جس پر مفصل روشنی ڈالنے کا یہ موقع نہیں ہے، اور نہ اتنا وقت ہی ہے، امام غزالیؒ کی "احیاء العلوم" اس موضوع پر بہترین کتاب ہے، آپ موقع نکال کر اس کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دینی درسگاہ میں طالب علم کو کیا کچھ ملتا ہے۔

کلام پاک کی نعمت

ابھی ابھی قاری جب تلاوت کلام پاک میں مشغول تھا تو مجھ پر صرف ایک کیفیت

شروع سے آخر تک طاری رہی اور وہ یہ کہ ہم جیسے ناپاک و نجس انسان جس کی حیثیت لاشئی محض کی سی ہے، وہ اور اس ذات عالی کا کلام جس نے بحر و بر، آسمان و زمین، شمس و قمر کو وجود بخشا اس کا کلام سمجھ سکیں، اس کے مخاطب بننے کے مستحق بن سکیں، الٰہی کیا مقام ہے، وہ شخص جس کی اس صفحۂ ہستی کے اوپر کوئی حیثیت نہیں آخر وہ اس نعمت عظمیٰ کو پا کر دیوانہ کیوں نہیں ہو جاتا، گریبان کیوں نہیں پھاڑ لیتا، کیا ہم اس قابل ہیں کہ خلاق عالم کے مخاطب بن سکیں، جب تک قاری تلاوت میں مشغول تھا مجھ پر صرف یہی ایک تاثر قائم رہا، یہ (فہم قرآن) اتنی بڑی نعمت ہے کہ اگر اس پر کوئی شخص خوشی سے دیوانہ ہو جائے اور گریباں چاک کر کے مجنونانہ کیفیت اختیار کر لے تو کوئی تعجب انگیز بات نہیں، کیا ابی ابن کعبؓ کا واقعہ بھول گئے، ذرا تاریخ کے اوراق کو الٹ کر ایک مرتبہ پھر نظر ڈالئے، جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ابی بن کعبؓ سے فرمایا کہ خدا نے تمہارا نام لے کر کہا کہ ان سے کلام پاک پڑھوا کر سنو تو سیدنا ابی ابن کعبؓ پر والہانہ کیفیت طاری ہو گئی، اور مارے خوشی کے چیخ نکل گئی، اور فرمایا "أو سمّانی ربی" ــــــــــــ اللہ اللہ کیا حال تھا، خدا اور اس کے رسول سے محبت و وارفتگی کا جس کا عشر عشیر بھی ہمارے نصیب میں نہیں۔

میرے عزیزو! اگر یہاں آپ کو کچھ نہ ملے، سارا مال خرچ کرنے کے بعد صرف یہی ایک نعمت ملے کہ ہم خدا کے کلام کے مخاطب بننے کے اہل ہو جائیں، تو سچ جانئے دنیا کی ساری لذتیں و آرائشیں سب اس ایک نعمت پر قربان، اور اس نعمت عظمیٰ کے ملنے کے بعد آپ کی ساری محنتیں وصول اور آپ کے والدین کی ساری کمائی حاصل۔

میرے عزیزو! یہ بات خوب ذہن میں بٹھا لیجئے کہ آپ یہاں کس لئے آئے ہیں، اپنی تعلیم میں لگنے سے پہلے اپنے مقاصد کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے، آپ کس نعمت کو حاصل کرنے

آئے ہیں، اس کے لئے ذہن کو بیدار کر لیجئے۔

تمہارا قصہ صرف یہی نہیں کہ تم زبردستی یہاں لائے گئے ہو، بلکہ تمہارے اور تمہارے خالق کے درمیان ایک سنہری زنجیر ہے جس کا اگر ایک سرا تمہارے ہاتھ میں ہے تو دوسرا سرا اللہ رب العزت کے قبضہ میں، گویا تمہارے اور اللہ کے درمیان ایک ایسا رشتہ ہے جس کی بناء پر تم اس کے کلام کو سمجھ سکتے ہو، اور اس کو اخذ کر سکتے ہو، اس سے بات کرنے کا طریقہ تمہیں معلوم ہے۔

مدرسے کا مقصد

میں کسی بھی مدرسہ کی یہ تعریف ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں کہ یہاں ایسی زبان سکھائی جاتی ہے جس کی بدولت عربی کتابیں پڑھی جا سکیں، اور اس سے دوسرے دنیاوی فائدے اٹھائے جا سکیں، عربی مدرسہ کی ہرگز ہرگز یہ تعریف نہیں، بلکہ وہ تو وہ جگہ ہے جہاں طالب علم کے درمیان جیسا کہ میں نے پہلے کہا، اور خدا کے درمیان ایک بلاواسطہ کی کڑی ہے جس کا ایک سرا ادھر ہے، اور دوسرا اللہ کے قبضہ میں ہے۔

ہمیں کیا کرنا ہے

میرے عزیزو! اس بات کو سمجھو کہ اس نعمتِ عظمیٰ کا اہل بننے کے لئے تمہیں کن باتوں کی ضرورت ہے، تمہیں کم سے کم کیا کرنا ہے؟ سب سے پہلے اپنے اندر شکر پیدا کرو، اکیلے میں بیٹھ کر سوچو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں انبیاءِ عظام اور اولیاءِ کرام کے راستہ پر ڈال دیا اگر تم پھر اپنی سابقہ جگہ پر پہنچ جاؤ تو یہ تمہاری بڑی بدقسمتی ہے، اس راستہ میں اولیاءِ کرام

اور انبیاء عظام کے نقش قدم نظر آئیں گے، اور اس سب سے بڑھ کر تمہیں علم نبوت کی روشنی ملے گی۔

دوسری چیز اس مدرسہ کی زندگی میں حسب استطاعت اپنے کو اس کے مطابق بنانا ہے، ہر راہ کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں، اس راہ کے تقاضے یہ ہیں کہ فرائض کی پابندی کی جائے، مثلاً نمازوں میں مستعدی، جماعت کے وقت سے پہلے مسجد آجاؤ، نوافل و دعا کا ذوق پیدا کرو۔

تیسری چیز، اپنے اخلاق کو بھی اسی کے مطابق بناؤ، تمہارے اندر صبر، زہد، استغناء کی کیفیت پیدا ہو جائے۔

چوتھی چیز، تمہارے اخلاق و آداب، طور و طریق، رہن سہن سب خالص اسلامی ہو، تمہارا مظہر بھی اس راستہ کے پیشواؤں کے مطابق ہو۔

مجھے خدا کی قسم تمہارے متعلق یہ خطرہ ہرگز نہیں کہ تم یہاں سے جانے کے بعد فقر سے دوچار ہوگے، خطرہ جو ہے وہ صرف اس بات سے کہ کہیں اس نعمت عظمیٰ کی ناقدری سے جو اللہ تعالیٰ تم کو عطا فرما رہا ہے تم پر ادبار نہ آجائے اور اگر تم نے شکر ادا کیا تو اس نعمت کے شکر کے عوض تمہاری استعداد کہیں زیادہ بڑھ جائے گی، "لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ"۔

لیکن جب تک تم اپنے اندر جوہر ذاتی نہ پیدا کرو گے اور استعداد میں پختگی نہ حاصل کرو گے، اس وقت تک تم کچھ بھی نہ ہوگے، اور دنیا میں بھی جا کر تم کچھ نہ کر سکو گے۔

آخر میں میں اس امر کو پھر صاف صاف بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ اپنے تعلیم شروع کرنے سے پہلے اپنے مقاصد اور اپنے مقام کو پہچانو، پڑھنا اور استعداد پیدا کرنا ہی صرف اپنا مقصود و نصب العین بناؤ، اس کے علاوہ کسی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو، انشاء اللہ دنیا میں بھی کامیاب و بامراد رہو گے، کامیابی و شادمانی تمہارے قدم چومے گی، اور پھر

اللہ رب العزت کے حضور میں حاضری کے وقت بھی سرخرو ہوگے، اللہ آپ کو کامیاب کرے۔ آمین

واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

ذاتی تعلق، ذاتی محنت
اور
جذبۂ خدا طلبی

۲۵ ر رجب ۱۳۸۵ھ مطابق ۲۰ ر نومبر ۱۹۶۵ء کو بعد نماز ظہر جمالیہ ہال میں طلبائے دارالعلوم کی طرف سے فارغ ہونے والے طلبہ کے اعزاز میں الوداعی جلسہ منعقد ہوا جس میں جانے والے طلبہ نے اپنے تاثرات پیش کئے، آخر میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ ناظم ندوۃ العلماء نے مختصر طور پر چند کلمات ارشاد فرمائے، اور محمد حمید اللہ منا روی اور عبد العلیم بستوی نے تقریر کو قلمبند کیا۔

ذاتی تعلق، ذاتی محنت اور جذبۂ خدا طلبی

عزیز طلباء!

قدیم رسم

مشرقی تہذیب میں بہت قدیم زمانہ سے یہ رسم چلی آرہی ہے کہ جب کوئی شخص کسی دور دراز سفر پر روانہ ہوتا ہے یا ایک دوسرے سے جدا ہوتا ہے تو اس وقت اپنے کسی بڑے مخلص یا تجربہ کار سے کچھ نصیحتیں اور کچھ وصیتیں سننا چاہتا ہے، جو اس نے اپنے زندگی کے تجربات سے حاصل کی ہیں، اس لحاظ سے اس وقت آپ کی یہ خواہش درست اور صحیح ہے، میں ہوتا یا میری جگہ پر کوئی اور شخص اور وہ آپ کو اس موقع پر کچھ ایسی باتیں بتاتا جن کو اپنا کر آپ کامیابی کی منزل کی طرف بڑھ سکتے اور آئندہ زندگی میں لائحہ عمل کے طور پر کام میں لاتے تو یہ عین مناسب بات تھی، لیکن میرے عزیزو! آج میں اپنے ان عزیزوں سے کیا کیا کہوں اور کن چیزوں کی طرف توجہ دلاؤں، بہر حال اس وقت میں مختصر طور پر کچھ کہوں گا، اگرچہ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ بسم اللہ... کو نکال کر سوئے ادب سے بچنے کے لئے شروع میں ۷۸۶ کا عدد لکھ دیا جائے لیکن ظاہر ہے کہ جو برکت بسم اللہ کے اندر ہے، وہ ۷۸۶ سے نہیں حاصل ہو سکتی، اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ پوری کتاب سے چند سطریں لکھ دی جائیں اور اس کو مختصر کر کے پیش کر دیا جائے، لیکن جس طرح سے میں نے ابھی عرض کیا کہ بسم اللہ کی جگہ ۷۸۶ کا

عدد نہیں لے سکتا، اسی طرح سے کتاب اور مضمون کی جگہ اس کی چند سطریں نہیں لے سکتی ہیں پھر بھی مختصراً میں تین باتیں کہوں گا اگر آپ سننا چاہتے ہیں تو ان کو لوحِ دل پر ثبت کرلیں اور دل ودماغ کے امانت خانہ میں اچھی طرح محفوظ کرلیں، اس سلسلے میں انسان کے لئے جو سب سے زیادہ مفید اور سب سے زیادہ قابلِ اعتماد چیز ہوسکتی ہے، وہ اس کے ذاتی تجربات ہوتے ہیں، جن میں کم سے کم شبہ کا امکان ہوتا ہے اس لئے اس وقت میں خود اپنے ہی تجربات آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

ذاتی تعلق

پہلی چیز وہ ذاتی تعلق ہے، جو مجھے اپنے اساتذہ سے ہمیشہ رہا، وہ تعلق نہیں جو ضابطہ کی خانہ پری کے لئے ہو، بلکہ وہ تعلق جو شب وروز کا تھا، اس تعلق کو میرے مخلص اساتذہ بھی محسوس کرتے تھے، اور میں بھی اس کو محسوس کرتا تھا، یہ وہ پہلی چیز ہے جس نے مجھے بہت نفع پہونچایا اور میں نے جو کچھ حاصل کیا وہ اسی کا صلہ ہے، خوش قسمتی سے میری تعلیم کا نظام کچھ ایسا رہا کہ اساتذہ کی تعداد کم تھی، اور اس وجہ سے ان کی قدر کرنے اور ان سے خصوصی تعلق رکھنے کے مواقع زیادہ تھے۔

ایک طالب علم کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ اس کا رجحان جس فن کی طرف ہو اس کے ماہر اور متخصص کے پاس رہ کر اس سے وہ اپنی صلاحیت کے مطابق استفادہ کرے، بغیر اس ربط کے وہ زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا، اگر آپ ادیب بننا چاہتے ہیں تو اس کی پیروی کریں، جس کا ادب آپ کے لئے زیادہ نفع بخش اور مفید ہو، اسی طریقہ سے اگر آپ کو تفسیر یا کسی اور فن سے لگاؤ ہے تو اس کے ماہر استاذ سے اپنا خصوصی ربط قائم رکھیں، اب آپ کے سامنے میں وہ چند باتیں پیش کرتا ہوں، جن کی رہنمائی اور روشنی میں آپ اپنے سفرِ زندگی کا آغاز کرسکتے ہیں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ آپ اپنے زندگی کے لئے ایک شخصیت کا انتخاب کرلیں، یہ حقیقت ہے

کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے، اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ کوئی بھی مخلص بندہ آپ کو کہیں مل جائے تو اس کو آپ اپنا رہنما مان کر اپنی زندگی کی نئی تعمیر شروع کریں، اس میں آپ کو پورا پورا اختیار ہے کہ جس کو چاہیں اور جہاں چاہیں ایشیا یا ایشیا سے باہر دنیا کے کسی گوشہ میں آپ اس کو دریافت کرلیں، بلکہ میں آگے بڑھ کر یہاں تک کہتا ہوں کہ زندوں میں آپ کو کوئی ایسا نظر نہ آئے تو ماضی کی شخصیتوں میں اس کو تلاش کیجئے اور جہاں کہیں یہ بندۂ خدا آپ کو ملے، اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیجئے، اور کچھ دنوں تک اس کی ہر چیز کو اپنے اندر منتقل کرنے کی کوشش کیجئے، انسان میں یہ صفت بہت نمایاں طور پر ہے کہ وہ جس چیز کو چاہتا ہے، اس کو نقل کرلیتا ہے، آپ اس کی ہر چیز کی نقل اتاریئے اس کے بعد آپ بڑے ہوسکتے ہیں، آپ اس سے آگے بھی نکل سکتے ہیں، اور ایسی جگہ بھی پہونچ سکتے ہیں، جہاں آپ کو اس تعلق کی ضرورت نہ ہوگی، اگرچہ یہ بات بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔

ذاتی محنت

دوسری بات جو آپ سے کہنی ہے، وہ یہ ہے کہ آپ تاریخ کی شخصیتوں میں سے جس کا بھی نام لیں، جب آپ اس کی سیرت کا مطالعہ کریں گے، اس کی زندگی کی تہ تک جانے کی کوشش کریں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس کی شخصیت کو بنانے اور سنوارنے والی سب سے اہم اور بنیادی چیز اس کی ذاتی محنت اس کی فکر و لگن، مقصد کی دھن اور اس کی تڑپ تھی، اس کے بغیر اگر اساتذہ چاہیں یا عظیم الشان ادارے اس کے لئے کوشش کریں کسی کے بس میں کچھ نہیں ہے، جو بھی بنا ہے، وہ اپنی ذاتی محنت اور جدوجہد سے بنا ہے، یقیناً اللہ تعالےٰ کی توفیق اور اساتذہ کی رہنمائی بھی ضروری ہے، لیکن اگر اللہ کی توفیق شامل حال ہے تو پھر اپنی ذاتی محنت سے انسان اپنے آپ کو سب کچھ بنا سکتا ہے۔

جذبۂ خدا طلبی

تیسری بات جو آپ سے کہنی ہے، وہ یہ ہے کہ انسان کو ہر وقت اس چیز کی فکر کرنی چاہئے، جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے، اور جو چیز اس کو حقیقت میں کام آنے والی ہے، وہ آخرت کی فکر، خدا کی مرضی اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کا شوق اور جذبہ ہے، اگر انسان کے اندر یہ چیز نہیں ہے تو خواہ وہ بڑے سے بڑا ادیب ہو، بہت بڑا مقرر و خطیب ہو، یا بہت بڑا مفسر و فقیہہ ہو، اِس دولت سے محروم ہی رہے گا، یہ ممکن ہے تھوڑی دیر کے لئے کچھ واہ واہ اور کچھ ناموری اور کچھ داد و تحسین حاصل کرلے مگر آگے اس کا کچھ حصہ نہیں، حقیقت میں جو چیز کام آنے والی ہے، وہ خشیتِ الٰہی ہے، وہ آخرت کی فکر ہے، وہ اللہ کی مرضی کی تلاش ہے، ایک مرتبہ مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ نے ایک طالب علم سے پوچھا تم کیا پڑھتے ہو۔؟

عرض کیا: "قاضی مبارک"

ارشاد ہوا: "استغفر اللہ" نعوذ باللہ قاضی مبارک پڑھتے ہو اس سے حاصل؟

ہم نے فرض کیا کہ تم منطق پڑھ کر قاضی مبارک کے مثل ہو گئے پھر کیا ---؟ قاضی مبارک کی قبر پر جاکر دیکھو کیا حال ہے، اور ایک بے علم کی قبر پر جاؤ جس کو خدا سے نسبت تھی اس پر کیسے انوار و برکات ہیں۔

میں نے مانا کہ آپ بڑے ادیب و انشا پرداز بن جائیں (اگرچہ میں اس کا پرزور داعی ہوں اور میں نے اس سے بہت کام لیا ہے) لیکن یہ سب چیزیں اسی وقت کام آسکتی ہیں، جب ان سے مطلوب رضائے الٰہی ہو۔

لہٰذا میرے عزیزو! ہر چیز پر اس کو مقدم رکھو اور اسی کو اپنا مقصد حیات بناؤ۔

۲۲ر نومبر ۱۹۶۵ء کو مولانا مدظلہ نے مدرسۂ ثانویہ کے انعامی جلسہ میں بچوں کو جو نصیحت کی وہ بھی مختصراً درج ذیل ہے ـــــ !

میرے عزیزو! آج تم کو دیکھ کر بڑی خوشی و مسرت ہو رہی ہے، ایسی ہی جیسے کسی خاندان کے بڑے یا بزرگ کو اپنے چھوٹے بچوں کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے، میں تم کو مبارک باد دیتا ہوں، اور سب سے بڑی مبارکباد اس پر کہ تم نے محنت کر کے انعامات کا استحقاق پیدا کیا اور تمہارے اساتذہ اور تمہارے ہیڈ ماسٹر صاحب نے تم کو اس کا اہل سمجھا، ان انعامات کی قیمت بازار میں کچھ زیادہ نہیں ہے جو تم کو کتابوں اور دوسری چیزوں کی صورت میں ملے ہیں، بلکہ اس لحاظ سے انعامات بہت قیمتی ہیں کہ اس وقت جب کہ تمہارے اساتذہ موجود ہیں یہ کہہ کر دیئے جا رہے ہیں کہ ہمارے ان بچوں نے مختلف چیزوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔

آج مجھے افسوس ہوتا ہے کہ جو چیزیں ہم نے اپنے بچپن میں بطور انعام حاصل کیں وہ بچپن کی بے خیالی میں ضائع ہو گئیں، اب میں تم کو نصیحت بلکہ وصیت کرتا ہوں کہ ان کو بہت اچھی طرح اور حفاظت سے رکھنا، آج میں نے تمہاری تقریریں سنیں، تمہاری تقریریں ریکارڈ کی گئی ہیں، یہ تقریریں تمہاری عمر اور تمہاری استعداد کے لحاظ سے بڑی غنیمت اور بہت اچھی ہیں، اور ایک اچھے مستقبل کی پیشین گوئی کرتی ہیں، مگر جی یہ چاہتا ہے کہ یہ تقریریں اور زیادہ بے تکلف اور سادہ ہوں کیونکہ اچھی تقریر وہی ہوتی ہے، جو زیادہ سے زیادہ سادہ اور بے تکلف ہو، یقیناً تمہاری تقریریں قابل مبارکباد ہیں، مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تمہارے اساتذہ اپنے مقصد میں بہت حد تک کامیاب ہیں، اب چند باتیں تم سے کہنا چاہتا ہوں جو تمہارے کرنے کی ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ انسان جو کچھ بچپن میں سوچتا ہے بعینہٖ ان چیزوں کو اللہ تعالےٰ نے کسی نہ کسی موقع پر پورا کر دیتا ہے، لہذا جو خیال کر دیا جو آرزو و تمنا کرو بہت سوچ سمجھ کر کرو،

ایسا نہ ہو کہ بعد میں تمہیں افسوس کرنا پڑے، یہ بڑے تجربہ کی بات ہے بچپن کا خیال حقیقت بن کر سامنے آتا ہے، ابھی سے تم یہ ارادہ کرو کہ تم اسلام کا نام روشن کرو گے، اللہ کا پیغام پہنچاؤ گے، اسلام کے سچے اور مخلص داعی بنو گے ایسا نہ سوچو جیسے بعض بچے سوچتے ہیں کہ ہم ٹی ٹی آئی (T. T. i) بنیں گے اور مفت سفر کیا کریں گے یا ہم تھانیدار یا اسی طرح کی اور بہت سی باتیں، یہ باتیں بُری نہیں ہیں، بلکہ تم کو اس سے بھی اونچا سوچنا چاہیے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم ٹی ٹی آئی کے بجائے گارڈ بننے کے لئے سوچنے لگو یا تھانیدار کے بجائے ایس پی (S. P.) بلکہ اللہ تعالیٰ کو بچپن کی معصومیت اتنی پسند ہے کہ اس وقت بچہ جو سوچتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو پورا کرتا ہے، تم اونچے سے اونچا ارادہ کرو اور اچھی سے اچھی آرزو کرو، تم یہ آرزو کرو کہ اللہ نے جو پیغمبروں سے کام لیا وہ ہم کریں گے، اللہ کے ولی اور دوست بنیں گے، ہم بہت بڑے عالم و فاضل بنیں گے اور اللہ کے بندوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچائیں گے، دیکھو انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ سب کچھ بن سکتا ہے، فرشتہ بلکہ فرشتہ سے بھی بڑھ سکتا ہے، اس لئے کہ انسان میں بہت سی وہ صلاحیتیں ہیں جو فرشتوں میں نہیں ہیں، جب معاملہ یہ ہے کہ آدمی بہت کچھ بن سکتا ہے، اور بہت بڑا بن سکتا ہے تو تم چھوٹی اور گری پڑی آرزوئیں کیوں کرو، تم ہمیشہ یہ آرزو کرو کہ اللہ ہمیں اپنے دین کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور تم سے وہ کام لے جس کی زمانہ کو ضرورت ہے، ہماری آرزو اور ہماری تمنا اور خواہش تم سے یہی ہے۔

آج نبوّتِ محمدیؐ پر الحاد و دہریت کا حملہ ہے کوئی شاہین ہے جو اس کے مقابلہ کی سعادت حاصل کرے؟

۳؍ جولائی ۱۹۶۶ء کو سلیمانیہ ہال میں طلبائے دارالعلوم کے سامنے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے ایک اہم تقریر کی جو مسلسل دو گھنٹے تک جاری رہی اور ریکارڈ بھی کی گئی، بعد میں شفیق رائے بریلوی نے اس کو قلم بند کیا۔

آج نبوّت محمدیؐ پر الحاد و دہریت کا حملہ ہے، کوئی شاہین ہے جو اس کے مقابلہ کی سعادت حاصل کرے؟

بعد حمد و صلوٰۃ!

طلبہ کی دو قسمیں

میرے عزیزو! بغیر کسی تکلف و تمہید کے میں تمہارے سامنے چند باتیں رکھنا چاہتا ہوں، عزیزوں سے کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہوا کرتی، خاندان میں تم نے کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ بڑا بھائی چھوٹے بھائی سے تصنع برتتا ہو یا چھوٹا بھائی بڑے بھائی سے بات کرنے میں تکلف و تمہید اختیار کرتا ہو۔

جو لوگ یہاں آئے ہیں، اور پڑھ رہے ہیں، ان کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں، ایک قسم تو ان بھائیوں اور عزیزوں کی ہے جو ماں باپ کے اصرار اور تقاضہ سے یا اس تعلق سے مجبور ہو کر جو اس معاشرہ میں والدین کا اولاد سے ہوا کرتا ہے، یہاں آئے ہیں، یعنی یہ کہ ہمارا ان کا جو تعلق ہے، وہ اس بنا پر ہے کہ وہ ماں باپ کے حکم کی تعمیل میں یہاں آئے ہیں، ان کی یہاں آنے کی نہ تو خواہش تھی اور نہ ان کے نزدیک اس کا کوئی فائدہ تھا، چنانچہ یہاں آنے کے بعد بجائے اس کے کہ یہاں ان کے دل میں اطمینان کی فضا قائم ہوتی، وہ اپنے والدین کے شکر گذار ہوتے، اور ان کی خیر خواہی کے قائل ہو جاتے کہ انھوں نے بہت صحیح جگہ کا انتخاب کیا اور ان کی زندگی کے لئے اچھا راستہ تجویز کیا،

ان کے اندر مزید کشمکش پیدا ہوگئی ہے، اب یہ کسی وجہ سے بھی ہو، میں اس کے اسباب نہیں بیان کروں گا، یہاں ان تفصیلات کی ضرورت نہیں، ان کے علاج کی ضرورت ہے۔

ان کو یہاں آکر روز بروز یہ محسوس ہونے لگا کہ ان کو فائدہ یہاں حاصل نہیں ہو رہا ہے، ان کے والدین غالباً یہاں کے حالات سے واقف نہ تھے، اور یہاں کی افادیت کا پوری طرح اندازہ انھیں نہیں تھا، وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ جتنا زیادہ یہاں قیام رہے گا اتنا ہی ہمارا وقت گذرتا جائے گا، اور کچھ حاصل نہ ہوگا، کوئی خاص چیز یہاں سے ہم لے کر نہیں جائیں گے اور ہمیں برباد کیا جا رہا ہے، مجھے اس پر تعجب نہیں کہ عربی مدرسہ میں ایسے لوگوں کی بھی کوئی قسم ہو سکتی ہے، اس لئے کہ واقعات کی دنیا میں بہت سی ایسی باتیں ہوتی ہیں، جن کو ہم پسند نہیں کرتے، یہ بالکل ممکن ہے کہ اچھے اچھے لوگ بھی جو بہت سعید اور صالح ہوں، اور بعد میں جا کر بہت ترقی کریں، علمی ترقی کریں دینی ترقی کریں، اولیاء اللہ بن جائیں، لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ جب تک ان کے دل کو اطمینان حاصل نہیں ہے، وہ کشمکش میں مبتلا رہیں، اور اس قسم کی ذہنی کشمکش میں مبتلا رہیں جو ہر وقت ان کے ساتھ رہتی ہے، اور کسی وقت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

ان سے مجھے یہ کہنا ہے کہ وہ اپنے فیصلہ میں بالکل آزاد ہیں، وہ اگر یہاں آکر بھی مطمئن نہیں ہوئے اگر وہ یہاں کے نظام کے ساتھ یہاں کے قواعد، قوانین، ضوابط اور یہاں کی فضا کے ساتھ اشتراک عمل نہیں کر سکتے، اور اس کے ساتھ خوشدلی کے ساتھ نہیں رہ سکتے، انھیں یہاں الجھن ہے، اور دن رات ان کو یہ الجھن ستاتی ہے، اور یہ ان کے لئے ایک مسئلہ بن گیا ہے، تو میں ان سے بہت ہی آزادی کے ساتھ، خلوص اور صاف دلی کے ساتھ کہوں گا کہ وہ طلباء ہمت اور اخلاقی جرأت سے کام لیں، اخلاقی جرأت سے بہت مدد ملتی ہے، اس سے لوگوں نے بڑے بڑے کام کئے ہیں، اس سے بڑے بڑے فیصلے صادر ہو چکے ہیں، وہ اپنے فیصلہ میں آزاد ہیں، وہ اپنے

والدین کو صاف صاف لکھ سکتے ہیں کہ یہاں آکر ہمیں اطمینان حاصل نہیں ہوا، ہم یہاں آکر کوئی فائدہ حاصل نہیں کر رہے ہیں، اور ہمیں یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارا وقت ضائع ہو رہا ہے، آپ بڑے مغالطہ میں مبتلا ہیں، اور خود کو دھوکے میں رکھے ہوئے ہیں، آپ سمجھ رہے ہیں کہ ہم یہاں بڑی محنت سے پڑھ رہے ہیں، لیکن واقعہ یہ نہیں ہے کس وجہ سے؟ یہ ہم آگے بیان کریں گے، یا پھر کسی موقعہ سے ذکر کریں گے، بہر حال حقیقت یہی ہے کہ یہاں ہمارا دل نہیں لگ رہا ہے، یہاں ہمیں کوئی فائدہ محسوس نہیں ہو رہا ہے، ان بھائیوں سے تو یہ کہنا تھا کہ وہ یہ فیصلہ کرلیں، ہمیں انشاء اللہ ان سے نہ کوئی شکایت پیدا ہوگی، اور نہ آئندہ ہمارے ان کے تعلق میں انشاء اللہ کوئی فرق واقع ہوگا، اور نہ ہم ان کے لئے خدانخواستہ کوئی بات زبان سے نکالیں گے۔

ہماری طرف سے اجازت ہے کہ وہ بخوشی اپنے گھر جائیں، والدین کے سامنے ذرا جرأت وہمت سے پوری بات رکھ دیں کہ آپ نے ہمیں جس دار العلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم پانے کے لئے بھیجا تھا، وہاں جاکر ہم مطمئن نہیں ہوئے، ہمارے لئے آپ کوئی دوسرا راستہ تجویز کیجئے۔

دوسری قسم

اب دوسری قسم وہ ہے جو یہاں آنے کے بعد یا یہاں آنے سے پہلے یہاں سے مطمئن ہو گئی ہے، اور جو یہ سمجھتی ہے کہ ہم مدرسہ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے ہمیں زریں موقع عطا کیا ہے، علوم دینیہ میں مہارت پیدا کرنے کے لئے دین کے مطالب کو اور اس کے مقاصد کو سمجھنے کے لئے، اس کے حقائق و معارف کو جاننے اور ان کے اندر تعمق پیدا کرنے کے لئے اللہ نے بہت اچھا موقعہ عنایت فرمایا، اس کے تمام سامان یہاں مہیا ہیں، تمام ضروری شرائط جو اس کے لئے ضروری ہیں، یہاں موجود ہیں، جن لوگوں کا کسی درجہ میں اس پر اعتقاد ہے

اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم دارالعلوم کی تعلیم سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور علوم دینیہ میں کمال حاصل کر سکتے ہیں، اور یہاں ہم ان مضامین میں جو پڑھائے جاتے ہیں، اچھی سمجھ اور اعلیٰ دستگاہ پیدا کر سکتے ہیں، اور سب سے پہلے اپنے لئے کہ سب سے پہلے یہی سوال ہے "قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا" اور ہر شخص اپنا ذمہ دار ہے "لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی" اس کے بعد اپنے اپنے والدین کے لئے خاندان کے لئے، بستی کے لئے پھر اللہ اگر ہمت و توفیق دے تو اپنے صوبے کے لئے اور توفیق و صلاحیت مزید عطا کرے تو ملک کے لئے اور اگر اللہ تعالیٰ اس سے بڑا حوصلہ اور ظرف عطا فرمائے تو پوری انسانیت کے لئے مفید ہو سکتے ہیں، اور نہ صرف یہ کہ ہم کو اللہ کا راستہ معلوم ہو جائے بلکہ ہم اس راستہ کی طرف دوسروں کو بلانے کی بھی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ نبوت (صلے اللہ علی صاحبہا وسلم) کی نیابت ہے، جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ وہ دولت ہے، جو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے اس کے مخصوص بندوں کو جن سے وہ امامت اور ہدایت کا کام لیتا ہے، ملتی ہے، ارشاد ہے "وَجَعَلْنَاھُمْ اَئِمَّۃً یَّھْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَکَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یُوْقِنُوْنَ" (ہم نے ان کو پیشوا بنایا، امامت کا منصب عطا کیا کہ ہمارے حکم سے وہ دوسروں کو بھی ہدایت کرتے ہیں) جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ صلاحیت و توفیق جس کسی کو نصیب ہو جاتی ہے، اس سے سو آدمی، ایک ہزار اور ایک لاکھ آدمی اور اللہ تعالےٰ کی فیاضی اور شان کریمی سے کچھ بعید نہیں کہ لاکھوں اور کروڑوں آدمی ہدایت پاتے ہیں، اس کے نامۂ اعمال میں لاکھوں اور کروڑوں آدمی لکھے جاتے ہیں، جیسا کہ خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے حساب میں لکھے گئے، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے حساب میں لکھے گئے، حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے حساب میں

لکھے گئے، امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حساب میں لکھے گئے، آج ساری دنیائے اسلام میں جتنے مسلمان ہیں، ان میں سے بہت تھوڑی تعداد مستثنیٰ کر کے تمام مسلمان چار مسلکوں میں بٹے ہوئے ہیں، مسلک حنفی، مسلک شافعی، مسلک مالکی اور مسلک حنبلی۔!

اب آپ یہ دیکھئے کہ ایک ایک کے حساب میں کتنے لوگ آئے، کروڑوں انسان ایک ایک امام کے حساب میں لکھے گئے، اگر ان کے اس زمانہ سے جس وقت انھوں نے مسائل کا استنباط کیا، اور لوگوں نے اس سے فائدہ حاصل کرنا شروع کیا، اس وقت تک کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حساب میں کتنے کروڑ بلکہ کتنے ارب انسان لکھے گئے اور یہ بھی تو دیکھو کہ کس خانہ میں لکھے گئے؟ نماز کی فرد میں لکھے گئے، روزہ کی فرد میں لکھے گئے، زکوٰۃ کی فرد میں لکھے گئے، ارکان اربعہ کی فرد میں لکھے گئے، ائمۂ اربعہؒ کی فہرست میں جو لوگ لکھے گئے، کس کس عنوان کے ماتحت ان کا اندراج ہوا، کتنی نمازیں ان کے حساب میں آئیں، اربوں انسانوں کے اعمال خیر ان کے نامۂ اعمال میں لکھے گئے، آج ابھی ظہر کی نماز آپ پڑھیں گے، یقین کیجئے اس بات پر کہ اس کا ثواب امام ابو حنیفہؒ امام شافعیؒ کی روح کو پہنچے گا، اس میں ذرا بھی کلام نہیں قرآن اس پر شاہد، احادیث اس پر شاہد، فقہ اس پر شاہد! اور تمہارے سامنے یہ علماء بیٹھے ہوئے ہیں، ان سے پوچھو کہ کیا اس کا ثواب امام ابو حنیفہؒ امام ابو یوسفؒ امام محمدؒ کو نہیں پہونچا؟ کیا اس کا ثواب امام شافعیؒ امام مالکؒ امام احمد بن حنبلؒ کو نہیں پہونچا؟ جن کے مسئلہ کے مطابق تم نے اپنی نمازیں درست طریقہ پر ادا کیں، جن کی محنت و استنباط کے نتیجے میں تم میں سے کسی نے اپنی نمازیں دعائے قنوت پڑھی اور کسی نے چھوڑ دی، ان کو بھی ثواب ملا اور تم کو بھی ثواب ملا۔

کیا کوئی اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے، ان کے اجر و ثواب کا؟ آج کون ریاضی داں ہے، جو ان ائمۂ اربعہؒ اور ان محدثین کرام اور ان فقہائے عظام اور ان مشائخ کبار کے ثواب کا حساب جوڑ سکے، اور اس کی کوئی میزان متعین کر سکے، کیا کسی میں یہ قابلیت ہے کہ امام شافعیؒ، امام غزالیؒ کے ثواب کا حساب جوڑ سکے؟ امام ابو حنیفہؒ کے ثواب سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ، مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے ثواب کی میزان مرتب کر سکے؟ کسی میں ہمت نہیں! یہ وہ جگہ ہے، جہاں یورپ کی ساری مشینیں عاجز ہیں، اور ساری دوربینیں عاجز ہیں، اور یورپ کے سارے سائنٹسٹ اور ریاضی داں عاجز ہیں۔

عصر حاضر کے فتنے

میرے عزیزو! خوش قسمتی سے تمہارا تعلق اسی قسم سے ہے جو یہ سمجھتی ہے کہ ہم عربی مدرسہ میں کیوں آئے؟ یہاں آنے کا کیا فائدہ ہے، جس کو یہ اطمینان ہے (خواہ کسی بھی درجہ میں سہی) کہ ہم یہاں رہ کر ان اماموں کی صف میں تو نہیں (کہ اس کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا) ان کے خادموں اور کفش برداروں کی صف میں شامل ہو سکتے ہیں، لیکن اللہ کے احکام جود و سخا میں کوئی فرق نہیں، اس کا فرمان اور اعلان ہے (كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا) وہ پھر کوئی نیا امام پیدا کر دے تو وہ اس پر قادر ہے، اور اگر پھر کسی کو ہدایت کا وہی ثواب عطا کرنے لگے اور وہی کام لے تو بالکل ممکن ہے۔!

آج کتنے بڑے بڑے فتنے ہیں، جو اس وقت جہنم کے شعلوں کی مانند بھڑک رہے ہیں اور پورے پورے اسلامی ملکوں کو جلا کر خاکستر کر دینا چاہتے ہیں، اور صحابۂ کرام رضؓ کے

کارناموں پر پانی پھیر دینا چاہتے ہیں۔

آج قسم قسم کے اسلام سوز، ایمان سوز، اخلاق سوز، انسانیت سوز فتنے ابھر رہے ہیں، مادیت، الحاد، قوم پرستی، نبوت محمدی صلے اللہ علیہ وسلم سے آنکھیں ملانے کے لئے تیار ہے، آج مسیلمہ کذّاب نئے نئے روپ میں آرہا ہے، اور نبوت محمدی کو چیلنج کر رہا ہے۔

آج رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سرمایہ پر ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے، آپ کے قلعہ میں شگاف پیدا کئے جا رہے ہیں، آپ کے دار السلطنت پر حملہ کیا جا رہا ہے، اگر آج امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ ہوتے تو میں یقین کرتا ہوں کہ شاید وہ فقہ کی تدوین بھی تھوڑی دیر کے لئے روک دیتے اور اس مسئلہ کی طرف توجہ کرتے، تم خوش قسمت ہو کہ فقہ حنفی، فقہ شافعیؒ کی تدوین کی خدمت تمہارے ذمہ نہیں ہے، اللہ کی حکمت بالغہ اور اس کی قدرت کاملہ نے اس کے لئے پہلے ہی انتظام کر دیا، اور امت کو امام شافعیؒ امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، اور امام احمدؒ جیسے ائمہ عطا کئے، جب کہ ایک لمحہ اور ایک منٹ کی تاخیر کی گنجائش نہیں تھی، تم خوش قسمت ہو، خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو، آج تمہارے لئے کام کے دوسرے میدان ہیں، آج تمہارے لئے الحاد سے پنجہ آزمائی کا موقعہ ہے۔

تمہارے لئے الحاد اور مادیت سے آنکھ ملانے کا موقع ہے، یقین مانو کہ اس سے امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ و امام احمدؒ کی روح نہیں، محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلم کی روح خوش ہو گی، آج کب سے یہ صدائیں لگ رہی ہیں کہ ؎

گوئے توفیق و سعادت درمیاں افگندہ اند
کس بہ میداں در نمی آید سواراں را چہ شد

تمہارا میدان

آج عالم اسلام کی نگاہیں ان درسگاہوں کی طرف لگی ہوئی ہیں، جو ان باتوں کو سمجھنے کی اہلیت وصلاحیت رکھتی ہیں، جن کے بانیوں نے اپنے نصاب ونظام میں اس کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی، کہ جب عصر حاضر کا کوئی نیا فتنہ پیدا ہو تو ہمارے فضلاء اس کو سمجھ سکیں اور اس کا مقابلہ کر سکیں!

نبوت محمدیؐ پر الحاد ودہریت کا حملہ

میرے عزیزو! تمہارے لئے کام کے کتنے وسیع میدان ہیں، اور ان میدانوں میں تھوڑی سی محنت سے آج کیا کچھ مل سکتا ہے، اس لئے جن لوگوں کو یہاں کا قیام عزیز ہو، یہاں کا نظام عزیز ہو، نصاب عزیز ہو، جن کو یہاں کی تعلیم وتربیت اس لئے عزیز ہو کہ نئے خالدؓ اور نئے ابو عبیدہؓ پیدا ہوں، اللہ کی لاکھوں اور کروڑوں رحمتیں ہوں ان کی پاک روحوں پر لیکن ان کی بے چین روحیں زبان حال سے کہہ رہی ہیں کہ وہ اب قیامت تک نہیں پیدا ہو سکتے، ہم نے تلوار چلانے اور گردن کٹانے میں ایک لمحہ کا تامل نہیں کیا، ہم نے اپنا کام ختم کر لیا، لیکن آج سر کٹانے اور کاٹنے کی ضرورت نہیں، آج تو باطل سے آنکھیں ملانے کی ضرورت ہے، آج نبوت محمدی صلے اللہ علیہ وسلم پر تلواروں کا حملہ نہیں، دلیلوں کا حملہ ہے، مادیت کا حملہ ہے، قوم پرستی کا حملہ ہے، ہمارے جو عزیز طلبہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں رہ کر اس سلسلہ میں کچھ کیا جا سکتا ہے، ان کے لئے یہ سعادت مقدر ہے، وہ اس میں حصہ لے کر ان ابرار واخیار، اور ان شہداء واتقیا کی صف میں جگہ پا سکتے ہیں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دعوت کا ایک ایسا میدان ہے،

کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے محض اپنی اس حکمت کی بنا پر جس کا راز کوئی نہیں جانتا۔ اس زمانہ کے پست ہمتوں کے لئے مقدر کیا ہے کہ اس میں تھوڑی سی محنت سے تم بہت کچھ پا سکتے ہو (من أحيى سنتي عند فساد امتي فله أجر مائة شهيد) کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ سنت کون سی ہے، بے شک اگر کوئی ایک سنت زندہ کرے گا تو سو شہیدوں کا اجر پائے گا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ "سنتی" میں سنت کی اضافت جو آپؐ نے اپنی طرف کی ہے، اس کے معنی ہیں میرا چلن، میرا طریقہ، میرا دین اور میرا مسلک، اب ذرا غور کرو کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جو دین لے کر آئے اس کی دعوت پر جو آج حملے ہو رہے ہیں، ان کے مقابلہ کے لئے اگر کوئی سربکف ہو کر میدان میں اتر آئے اور ان حملوں کے لئے سپر بن جائے تو اس کا مقام کیا ہوگا، یہ مدرسہ جس کو تم حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو، یہاں کی ناتمام عمارتیں، یہاں کے متواضع اور خاکسار اساتذہ یہاں کی بے سروسامانیاں اور یہاں کی بہت سی خامیاں اور یہ کھانے کی خرابیاں ——، "واللہ العظیم" اسی بنا پر ہو سکتا ہے کہ یہاں سے ایسے ایسے لوگ پیدا ہوں جو حق و باطل کے معرکۂ کارزار کے لئے شہسوار ہوں، اور جانباز ہوں، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے کو پھر سے بلند کریں، اور ملحدانہ اور مادہ پرستانہ تحریکوں اور ایمان سوز فتنوں کا جرأت کے ساتھ مقابلہ کریں، جس کے لئے روح نبوی صلے اللہ علیٰ صاحبہا بےچین و مضطرب ہے، اگر ایک ایسی جیتی جاگتی مثال بھی یہاں موجود ہے، اگر ایک دھڑکتا ہوا دل، ایک دیدۂ بینا اور ایک گوش شنوا یہاں حاضر ہے، اور ایک متنفس بھی ایسا ہے جس کو اس بات کا احساس ہے کہ یہاں رہ کر یہ کام ہو سکتا ہے، جو یہ سمجھتا ہے کہ وہ دن ہماری عمر، ہمارے خاندان اور ہماری بستی کی زندگی میں بلکہ ہماری اس پوری آبادی کی زندگی میں بڑا مبارک تھا جس دن ہمارے والدین نے ہم کو دارالعلوم بھیجا، ان سے ہم کہتے ہیں کہ آج وہ فیصلہ کر کے اٹھیں کہ یہاں وہ اپنے وقت کو

صحیح طور سے صرف کریں گے، یہاں کے درخت سے وہ بہتر سے بہتر پھل توڑیں گے، جس کی توقع کی جاسکتی ہے، وہ یہاں کتاب وسنت کا گہرا اور عمیق علم حاصل کریں گے، اور وہ زندگی گذاریں گے جو ایک داعی اور عالم ربّانی کی زندگی سے مطابقت رکھتی ہے۔

یکسوئی کی ضرورت

کتنا بڑا ظلم ہے کہ لوگ ساری دنیا کے راستے بند کر کے اور ساری کشتیاں جلا کر یہاں آکر پڑ گئے ہوں، تم یہاں رہ کر یہ معاملہ کرو کہ تمہارا ایک پاؤں یہاں رہے، اور ایک پاؤں خدا کے دشمنوں کے ساتھ، دشمنانِ اسلام کے قلعہ میں! تمہارا جسم یہاں رہے، اور تمہارا دل باہر! تم یہاں رہو، تمہاری آنکھیں باہر رہیں، اس کی کون اجازت دے سکتا ہے؟ کوئی چھاؤنی اس کی اجازت دے سکتی ہے۔؟ مدرسہ بھی ایک چھاؤنی ہے؟ کوئی درسگاہ اس کی اجازت دے سکتی ہے؟ کوئی نظام اس کی اجازت دے سکتا ہے؟ اشتراکی نظام؟ سرمایہ دارانہ نظام؟ کوئی نظام اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ آدمی روس میں رہے، اور امریکہ کا خواب دیکھے یا امریکہ میں رہے اور روس کی طرف دیکھے تو جب ان آزاد لوگوں میں جن کے لئے دنیا میں کوئی قید و بند نہیں، شراب پیو، جوا کھیلو، بدمعاشیاں کرو، جب ان کے یہاں بھی اس بات کی اجازت نہیں ہے، اور اب تو اس کی بھی اجازت دینے کے لئے لوگ تیار نہیں ہیں کہ ہندوستان میں رہ کر آدمی پاکستان کی طرف دیکھے تو بتاؤ ہم تمہیں کیسے اجازت دیں کہ تم یہاں رہ کر کالج کی طرف دیکھو، یونیورسٹی کی طرف دیکھو، رہو یہاں اور تیاری کرو وہاں کے لئے یہ کہاں کی دیانت داری اور کیسی تقسیم ہے؟ کہ ہم تمہارے لئے ایک ایک دانہ مانگ کر لائیں (یہ یقیناً احسان نہیں ہمارا فرض ہے) اور تم اس سے ناجائز فائدہ اٹھاؤ۔

جو لوگ ہدایت و دعوت کا کام کریں گے ان کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے ـــــ

"وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى"

بھلا بتایئے یہاں کیا موقع تھا "نَحْنُ نَرْزُقُكَ" کہنے کا؟ بڑے بڑے علماء موجود ہیں ان سے پوچھو کہ فرمایا تو یہ جا رہا ہے کہ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور اس پر جمے رہو اور پھر "لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا" ہم آپ سے رزق کے طالب نہیں!

یہ تو ظاہر ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ رزق کے طالب نہیں ہوتے پھر اس کی کیا ضرورت تھی؟ اس کے وسیع معنی ہیں، یعنی ہم اس کے بھی طالب نہیں کہ آپ بھی رزق کے خود کفیل اور ذمہ دار بن جائیں "نَحْنُ نَرْزُقُكَ" ہم اس کے ذمہ دار ہیں! آپ اس کے ذمہ دار نہیں۔! معلوم ہوا کہ امر بالصَّلوٰۃ اور اس پر محافظت و استقامت سے اللہ کے یہاں رزق کا استحقاق پیدا ہو جاتا ہے، جس کا مطلب یہ نکلا کہ داعی کو اللہ تبارک و تعالیٰ انشاء اللہ بے یار و مددگار اور فاقہ کش کبھی نہیں رکھے گا، بلکہ اس کے طفیل میں ہزاروں آدمی کھائیں گے، ایک شیر شکار کرتا ہے، اس کے طفیل میں سیکڑوں جنگل کے جانور کھاتے ہیں، حضرت نظام الدین اولیاء کے دسترخوان کو دیکھو، اس عہد آخر میں مظاہر علوم میں حضرت شیخ الحدیث کے دسترخوان کو دیکھو! اور جن خوش قسمتوں نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے دسترخوان کو دیکھا، ان سے پوچھو کہ ایک شیر شکار کرتا تھا اور کتنے جنگل کے اس کے ہم جنس کھاتے تھے۔

اللہ کی ضمانت ہے، کچھ دن تم محنت کر لو، سعید، ہونہار، محنتی اور جفاکش طالب علم بن جاؤ اور اپنے اندر اخلاص پیدا کرو، اور پھر اللہ کی قدرت و رحمت کا تماشا دیکھو!

ایک فیصلہ

بس بھائی! سمجھنے والوں کے لئے اور جن کے لئے اللہ نے سعادت اور خوش بختی مقدر

کی ہے، اتنا ہی بہت کافی ہے، بلکہ کافی سے بھی زیادہ ہے، لیکن آج جو کچھ آپ نے سنا ہے، اس سے فائدہ اٹھائیے اور فیصلہ کیجئے! "جانے کا فیصلہ — یا — رہنے کا فیصلہ" جانے کا فیصلہ ہے تو شریفوں کی طرح اور انسانوں کی طرح! اور رہنے کا فیصلہ ہے تو وہ بھی شریفوں کی طرح اور جوانمردوں کی طرح، طالب علموں کی طرح، صاحب عزم اور صاحب ہمت نوجوانوں کی طرح۔!!

اخلاص اور اختصاص

یہ دو چیزیں انسان کو کامل بنانے کے لئے کافی ہیں

طلبہ کے سالانہ افتتاحی جلسہ میں جو بتاریخ ۲۰؍جنوری ۱۹۶۷ء دارالعلوم کی وسیع و خوبصورت مسجد میں منعقد ہوا، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے حسب ذیل تقریر فرمائی، سید شرافت علی متعلم نے اس کو قلم بند کیا۔

اخلاص اور اختصاص

یہ دو۲ چیزیں انسان کو کامل بنانے کے لئے کافی ہیں

حمد و ثنا کے بعد فرمایا!

میرے عزیزو اور بھائیو! ہمارا تعلیمی سال شروع ہو رہا ہے، آپ میں سے کچھ طالب علم ایسے ہیں جو یہاں ایک عرصہ سے مقیم ہیں، اور جن کو سات آٹھ سال ہو چکے ہیں، اور کچھ ایسے ہیں، جو نئے ہیں اور اسی سال یہاں آئے ہیں، لیکن مناسب اور مفید یہ ہے کہ آپ سب اپنے آپ کو نیا طالب علم سمجھیں، اپنا مقصد متعین کریں، اپنے اندر جوش، ولولہ اور ایک نیا عزم پیدا کریں، مدرسہ کا بند ہونا، اور کھلنا، نصاب کا شروع ہونا، طلبہ کی آمد اور تقریروں کا انتظام یہ سب نئے عزم نئے ولولہ اور جذبہ کے لئے ہے، اور انتہائی مفید اور کارآمد بات ہے۔

تمام طلبہ کو خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید، یہ سمجھنا چاہئے کہ ہم اپنی کتابِ زندگی کا نیا ورق پلٹ رہے ہیں، کسی درسی کتاب کا ورق نہیں، اپنی کتابِ زندگی کا ورق! در حقیقت آپ ایک سفر پر روانہ ہو چکے ہیں، آپ کو چاہئے کہ اس سفر کے متعلق آپ اپنے اساتذہ سے، اپنے ہمدردوں سے نصیحتوں کا مطالبہ کریں، یہ آپ کا حق ہے، کیونکہ انسان جب کسی سفر پر جاتا ہے تو اس کے بزرگ اس کو نصیحت کرتے ہیں، انسان کی بہتری اور بدتری صرف فائدہ کے احساس ہی پر منحصر ہے، اگر یہ احساس ختم ہو جائے تو پھر انسانیت کی خیر نہیں کیونکہ یہی وہ

واحد سہارا ہے، جسے تمام انسانوں نے بلکہ انبیاء تک نے اپنایا ہے، اور اسی "سہارے" سے سہارا لیا ہے، دنیا کی تمام ترقیاں اسی فائدہ پر منحصر و مشتمل ہیں، اسی "فائدہ" کی بنا پر انسان کا انسان سے رشتہ قائم ہے، تاجر کا گاہک سے رشتہ، باپ کا بیٹے سے رشتہ، سب کا سب فائدہ پر ہی منحصر ہے۔

آپ کا ہم سے جو رشتہ ہے، وہ بھی فائدہ کے لئے ہے، آپ بھی فائدے کے طالب ہیں، صرف اسی فائدہ کی امید پر آپ یہاں آئے، والدین، بھائی، بہنوں کو چھوڑا، اور گھر کو خیر باد کہا۔

عزیزو! دوستو! اس وقت کہنے کی باتیں بہت ہیں، اور سب کو تفصیل سے بیان کرنا ممکن نہیں، لہذا ایک بات سنئے! اور کان کھول کر نہیں بلکہ دل کھول کر سنئے! اس لئے کہ اس میں آپ ہی کا فائدہ ہے، وہ بات یہ ہے، آپ یہاں آئے ہیں تو اچھا اور کامیاب بننے کی کوشش کیجئے، اگر کہے بغیر کام چل سکتا تو میں اپنا دل نکال کر آپکے سامنے رکھ دیتا لیکن خدا نے الفاظ کا محتاج بنایا ہے، خود کلام الہٰی اس کی بیّن دلیل ہے، بہر حال میں یہی کہوں گا کہ قیمتی سے قیمتی بننے کی کوشش کیجئے، اور یہی انسان کی فطرت ہے! اگر یہ جذبہ انسان کے اندر نہیں تو وہ حیوان ہے، اسی جذبے کے تحت انسان وہاں تک پہونچ گیا جہاں تک فرشتے نہیں پہونچ سکے۔

قیمتی دفینہ

عزیزو! ایک شخص کو کوئی چیز دفینہ میں ملی، وہ اس کو لے کر جوہری کے پاس آیا، جوہری نے کہا کہ یہ ہیرا ہے، اور بہت قیمتی ہے، لیکن اس کی تین شرطیں ہیں۔

۱۔ جب تک اس کو چمکایا نہیں جائے گا، اور اس کے کونے برابر نہیں کئے جائیں گے،

اس وقت تک وہ بے قیمت پتھر ہے۔
۲۔ یہ بہت نازک ہے اگر یہ کہیں سے چٹک گیا تو بیکار ہو جائے گا۔
۳۔ اگر یہ چٹک گیا تو پھر یہ درست نہیں ہو سکتا۔

اب عقلمندی یہ ہے کہ جس شخص کو بھی یہ ہیرا ملے وہ ان تمام شرائط اور اوصاف کی فکر کرے، بازار میں کسی بہتر جوہری کو تلاش کرے، اس کو احتیاط اور اہتمام سے بنوائے اور اس کے بعد منہ مانگے داموں پر فروخت کر کے نفع کمائے۔

میرے عزیزو! میں خانۂ خدا میں منبر مسجد کے پاس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ ہیرا تمہارے پاس موجود ہے، اور تم میں سے ہر شخص اس کا مالک ہے، وہ ہیرا تمہاری زندگی کی صلاحیت ہے، پڑھنے کی صلاحیت، فرمانبرداری کی صلاحیت، اور بہتر بننے کی صلاحیت ہے یہ وہ صلاحیتیں ہیں، جن پر ملائکہ کو رشک آتا ہے ــــ ان صلاحیتوں سے تم اس مقام پر پہونچ گئے جس کے بارے میں ارشاد ہے کہ "مالاعین رأت ولااذن سمعت ولاخطر علی قلب بشر" ان صلاحیتوں سے تم ولی بن سکتے ہو، خدا کے محبوب ہو سکتے ہو، اور جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

تم کیا بن سکتے ہو؟

تم ایسے بن سکتے ہو کہ تمہارا شہر نہیں پورا ملک بلکہ پوری امت اور ملت کی تقدیر بدل سکتی ہے تم وہ پارس بن سکتے ہو کہ اگر تم سے کوئی خدا کا باغی اور سرکش چھو جائے تو ولی کامل بن جائے جس بستی میں تم جاؤ وہاں بہار آجائے، وہاں کا موسم اور فضا بدل جائے، یہ تاثیر آج بھی تمہارے اندر پیدا ہو سکتی ہے، تمہاری وجہ سے نہ جانے کتنی قومیں جنتی ہو سکتی ہیں، بے شک

نبوت تو ختم ہو چکی! لیکن تم "آیۃ من آیات اللہ" بن سکتے ہو، حجۃ الاسلام شیخ الاسلام ہو سکتے ہو، سب سے بڑھ کر یہ کہ تم نائبان رسول ہو سکتے ہو، یہ سب چیزیں تم کر سکتے ہو، لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ تم عزم کرو، کیونکہ تم خدا کا قرب حاصل کرنے کے لئے آئے ہو، صاحب کمال اور صاحبِ امتیاز بننے کے لئے آئے ہو، اگر تم کامیابی اور ترقی کا فیصلہ کر لو تو اس کائنات کا ذرہ ذرہ تمہاری مدد کرے گا، پورا نظام کائنات تمہارے لئے وقف ہو جائے گا، حدیث اس بات پر شاہد ہے۔

میں تم سے پوچھتا ہوں کہ وہ کون بد نصیب شخص ہوگا جو کامیاب بننا نہ چاہے، پتھر بھی ترقی سے انکار نہیں کر سکتا، کائنات کا ذرہ ذرہ عروج و ترقی کا متمنی ہوتا ہے، ایک تخم کو دیکھو وہ ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا ایک درخت بن جاتا ہے، اور ترقی کے آخری اسٹیج پر پہونچ جاتا ہے، لیکن تمہارا سفر ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہوا موت کے بعد تک جاری رہے گا اور تم ترقی کے مدارج طے کرو گے، حتیٰ کہ تمہاری آسودگی دیدار الٰہی سے ہوگی اور یہ تمہاری آخری اور ابدی منزل ہے، تمہارا اولین فرض یہ ہے کہ تم اپنے دلوں میں عزم و ارادہ پیدا کرو، اس لئے کہ تم کو بہتر سے بہتر بننا ہے ؎

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا، نہ بن، اپنا تو بن

اگر تم ہمارے نہیں بن سکتے، اپنے اساتذہ اور ہمدردوں کے نہیں بن سکتے، نہ بنو! اپنا تو حق ادا کرو۔

میں تم سے بار بار یہی کہوں گا کہ اچھے سے اچھا بننے کی کوشش کرو، کیونکہ ——— تمام عالم یہ شہادت دیتے ہیں کہ خدا نے انسان کو بہترین بننے کے لئے پیدا کیا ہے، اور

انسان سے اس کا مطالبہ کیا ہے "ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ ثُمَّ ھَدیٰ" ـــــ میرے عزیزو! تم اپنے دلوں میں لکھ لو، عہد کر لو کہ ہم کو اچھے سے اچھا بننا ہے، یہ تمہارے دل کی آواز بلکہ ایک قدم بڑھا کر کہتا ہوں کہ یہ قرآن کی آواز ہے کہ تم بہتر اور قیمتی بنو، جس طالب علم میں یہ جذبہ نہیں وہ درحقیقت سڑی مٹی ہے، جس میں تخم ضائع ہوتا ہے۔

دو راستے

میں کسی قیمت پر بھی یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ تم میں اچھے بننے کی صلاحیت نہیں ہے، یہ ایک سچا اور حقیقی جذبہ ہے، جس کی شریعت نے اور انبیاء کے صحیفوں نے ہمت افزائی کی ہے، انسان کے قبضہ میں ہر منزل ہے، صرف خدائی اور نبوت اس سے مستثنیٰ ہے۔

تمہارے سامنے صرف دو راستے ہیں، ایک تو یہ ہے کہ تم یہاں آؤ اور فارغ ہو کر چلے جاؤ اور اچھا بننے کی کوئی کوشش یا ارادہ ہی نہ کرو، دوسرے یہ کہ یہاں اچھے سے اچھا بن کر جاؤ اور علمی اور روحانی ہر حیثیت سے ترقی کرو، یہ دونوں راستے تمہارے لئے کھلے ہوئے ہیں، تم یہاں بہتر سے بہتر بن سکتے ہو، یہاں کوئی رکاوٹ نہیں، یہاں سے جانے کے بعد کسی طالب علم کو یہ کہنے کا کوئی حق نہیں ہے کہ میں ندوۃ العلماء میں اچھا نہیں بن سکا، ندوہ ہی نہیں کسی مدرسہ کی بابت، دیوبند، مظاہر علوم کے متعلق کوئی بھی ایسا نہیں کہہ سکتا۔

محنت و کاوش

تاریخ و تذکرہ میرا موضوع ہے، اور میں اپنے مطالعہ اور تجربہ پر اعتماد کر کے کہتا ہوں کہ کوئی مدرسہ اور کوئی کتب خانہ کسی انسان کو نہیں بناتا، انسان خود اپنی قوت بازو سے

اپنی محنت اور کاوش سے بنتا ہے اگر آپ بزرگی کے شعبہ میں دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہی برگزیدہ بندے تھے جن کے سرپرست ولی نہیں تھے ان کے لئے ماحول ناسازگار تھا لیکن وہ اپنی محنت سے اپنی تڑپ اور پیاس سے ولی کامل بن گئے، ہزاروں مثالیں ہیں کہ آذر کے گھر سے ابراہیمؑ پیدا ہوئے، حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کے والد کے متعلق کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ ولی تھے، لیکن اپنی طلب اور تڑپ کے بل بوتے پر وہ حجۃ الاسلام بن گئے۔

سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی مثال

سیدنا شیخ عبدالقادرؒ کی زندگی کا مطالعہ کیجئے، ان کے والد نہ کوئی عالم تھے، نہ ولی، مرتے وقت ایک صاحب کو صاحبزادہ کی تعلیم کے لئے وصیت کر گئے، لیکن ان کی ماں نے چرخہ کات کر ان کو پڑھایا اور اعلیٰ تعلیم دلوائی پھر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ترقی کے ان مراتب پر فائز ہوئے جو رشک کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں، ان کے بغداد جانے کا واقعہ مشہور ہے، یہ سب کیا تھا محنت اور تڑپ تھی۔

سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے متعلق ہندوستان بھر میں ندوۃ العلماء کے کتب خانہ سے زیادہ کتابیں اور کہیں نہیں ہیں، اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ نواب نورالحسن صاحب شیخ سے انتہائی عقیدت رکھتے تھے، اور اس سلسلہ میں انھوں نے بیشتر کتابیں اکٹھا کیں، ان کے بعد ان کا کتب خانہ ندوہ ہی میں آیا۔ ان تمام کتابوں میں میں نے یہ کہیں نہیں پایا کہ ان کے والد کوئی بڑے آدمی یا عالم تھے۔

ترقی اور کامیابی موروثی نہیں ہوتی، عبدالقادر جیلانیؒ کے والد اور دادا صرف کاشتکار تھے، لیکن سیدنا عبدالقادر جیلانی؟

عزیزو! یہ سب محنت اور کوشش ہی پر منحصر ہے، طلب اور تڑپ پر اس کا

دارومدار ہے،عزم وہمت اور بلند حوصلگی اس کی بنیاد ہے۔ ؎

یا تن رسد بہ جاناں یا جاں زتن برآید

ایک شعر

ایک شعر میں اکثر پڑھا کرتا ہوں اور جی چاہتا ہے کہ کسی خوشنویس سے اس کی کتابت کرواکے آویزاں کراؤں، حضرت مفتی صدرالدین آزردہ نے فرمایا ہے ؎

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سوایسا زیاں نہیں

ان کے نزدیک اتنے بڑے مقصود میں جان کا چلا جانا کوئی اہم بات نہیں، یہ سب کیا تھا؟ ان کے دل میں عشق الٰہی کی چنگاری تھی، ان کی طبیعت بے قرار تھی، حضرت مخدوم بہاری کا واقعہ پڑھو، جب گھر سے پڑھنے گئے تو ہر چیز سے بے پرواہ ہو گئے، گھر سے خطوط آتے رہے اور وہ ایک گھڑے میں ڈالتے رہے، انھوں نے طے کرلیا تھا کہ یہ سب تعلیم سے غافل کرنے والی چیزیں ہیں، چنانچہ انھوں نے اس سے پرہیز کیا، جب وہ اپنی تعلیم سے فارغ ہوئے اور خطوط کا انبار سنبھالا اور پڑھنا شروع کیا تو کہیں آبدیدہ ہوئے اور کہیں خوش ہوئے اور چہرہ پر بشاشت وسرور کی لہریں دوڑ گئیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ والد تونولی ہیں، تمام حالات سازگار اور وسائل مہیا ہیں، لیکن صاحبزادہ میں کوئی تڑپ یا طلب ہی نہیں، ایسی مثالیں آج کل بھی مل سکتی ہیں، بڑے بڑے بزرگوں کی اولاد کچھ نہیں، بے قیمت —— یہاں تو محنت اور کوشش اور قربانی دینے کے بعد ہوتا ہے۔ ؎

رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ گھس جانے کے بعد

جب تک انسان کچھ کھوئے گا نہیں، کچھ پائے گا نہیں، آپ کے سامنے دونوں صورتیں ہیں، فاسق و

فاجر کی اولاد ولی کامل، اور اولیاء اللہ کی اولاد باغی اور سرکش، یہ سب عزم و محنت اور فیصلہ پر مبنی تھا، یاد رکھئے کہ شکوے وہ کرتے ہیں، جن کو کچھ ترقی نہیں کرنا ہے، وہ کرتے ہیں جو کوتاہ دست ہیں۔

عزیزو! یہ ممکن ہے کہ ایک چھوٹے سے مدرسہ میں رہ کر آپ حجۃ الاسلام اور شیخ الاسلام بن جائیں اور مدینہ یونیورسٹی، قاہرہ یونیورسٹی، دیوبند، مظاہر علوم اور ندوہ میں کچھ نہ بن سکیں کیونکہ یہ عزم و حوصلہ اور جذبہ و فیصلہ پر منحصر ہے۔

تم آج اس خانۂ خدا سے عہد کر کے اور فیصلہ کر کے نکلو، اس وقت اگر تم سے کہا جائے کہ تمہاری ٹوپی میں ہیرا ہے تو تم اس کے لئے جدوجہد کروگے، میں کہتا ہوں تمہارے پاس وہ قیمتی ہیرا ہے کہ پورا عالم تمہاری صلاحیت کی قیمت ادا نہیں کر سکتا، ساری دنیا کی سلطنتیں تم کو خرید نہیں سکتیں، بڑے بڑے عارفوں نے دعویٰ کیا کہ ہماری قیمت کوئی ادا نہیں کر سکتا، تم میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ مجھ کو کوئی خرید نہیں سکتا۔

میں تو ایک قدم بڑھ کے کہتا ہوں کہ الیکشن اور اس کے ہنگامہ کی حیثیت ہی کیا ہے؟ اگر یہ اسلام اور مسلمانوں کا مسئلہ اور حالات کی تبدیلی کا ایک ذریعہ نہ ہوتا تو ہم ایسے الفاظ کے استعمال کے بعد اپنی زبانوں کو دھوتے، ہم تو وزیروں سے ملاقات کرنا خود ان کا اعزاز سمجھتے ہیں، اس مجلس میں ایسے لوگ موجود ہیں، جنھوں نے کسی صوبائی وزیر نہیں وزیر اعظم سے ملاقات سے انکار کر دیا، ریاستی وزیر، چیف منسٹر کا کیا ذکر۔؟

عزیزو! تم اپنی قیمت پہچانو، تمہارے مستقبل کی ضمانت پیغمبر اور خدائے لازوال نے لی ہے، بس شرط یہ ہے کہ تم ہیرے کو واقعۃً ہیرا بنالو پھر ایک بار نہیں کئی بار ٹوٹتا ہے اور بنتا ہے، شیشہ بھی ٹوٹتا اور بنتا ہے لیکن ہیرا صرف ایک بار ہی بن سکتا ہے ٹوٹ کر یا چٹک کر وہ دوبارہ نہیں بن سکتا۔

اگر تم اچھا بننا چاہو گے تو تمہیں کوئی روک نہیں سکتا اور نہ بننا چاہو گے تو مشیت الٰہی کے علاوہ کوئی شئی تم کو بنا نہیں سکتی۔

عزیزو! میں تو کہتا ہوں کہ تم خدا اور نبی نہیں بن سکتے، باقی سب کچھ بن سکتے ہو، کس کو امید تھی کہ اس ہندوستان میں مولانا الیاسؒ اور مولانا یوسفؒ صاحب پیدا ہوں گے؟ کون جانتا تھا کہ بڑے بڑے عالم نکلیں گے؟ یہ سلسلہ تو اب بھی جاری و ساری ہے، تم اس کا عہد کرو کہ تمہارے لئے یہاں سے نکلنا حرام ہے، مگر یہ کہ تم یہاں سے اچھا اور بہترین بن کے نکلو، اور دنیا کی تمام طاقتیں تمہارے لئے سرنگوں اور مطیع ہوں ؎

مثل کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگ لاتخف

اخلاص اور اختصاص

آج بھی وہ صوت سرمدی موجود ہے "أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ" تم کو اب کس کا ڈر ہے؟ خدا کہہ رہا ہے، مگر اس کے لئے دو باتیں لازمی ہیں (۱) اخلاص (۲) اختصاص (امتیاز) یہ دو چیزیں اچھا سے اچھا بنانے کے لئے کافی ہیں، پوری دنیا کا کہنا غلط، خدا اور اس کے رسول کا کہنا برحق!

آخر میں، میں اساتذہ حضرات سے کہتا ہوں کہ آپ ان کی مدد کریں کیوں کہ آپ کے پاس سیکڑوں ہیرے آگئے ہیں، یہ ہیرے خدا کی نعمت اور دولت ہیں، اب آپ کہاں پتھر آزمانے جائیں گے؟ اپنی صلاحیت کہاں گنوائیں گے۔؟

میں نے ایک ایسے مدرسہ میں بھی پڑھا ہے، جہاں طلباء کو روٹی اور پانچ پیسے دیئے جاتے تھے، اور ہم ان پانچ پیسوں سے بدمزہ سالن خرید کر استعمال کرتے لیکن اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتے بلکہ اپنے کام اور کوشش میں محو رہتے تھے، اپنے عزم و منزل کا خیال رکھتے تھے، یہ سب اسی کی برکت ہے۔

اگر تم یہاں کے نظام کی شکایات کرو تو تمہارے لئے کوئی جواز نہیں، میں صاف کہتا ہوں، یہاں کے انتظامات ناکافی ہیں، آپ خود دیکھئے گرانی کا کیا عالم ہے، غذائی بحران ہے، ہزاروں روپیہ پانے والے پریشان ہیں، اگر تم کو آدھا پیٹ بھی ملے تو صبر و شکر کرو، فکر نہ کرو!

اچھا بننے کی کوشش کرو

آخر میں پھر کہوں گا کہ اچھا بننے کی کوشش کرو اور عزم کرو، اپنی عزت، حتیٰ کہ صحت کا بھی خیال نہ کرو تم کو یہاں پر سعید اور صابر اولاد بن کر رہنا پڑے گا، پھر تمہارے لئے سارا عالم مسخر ہو جائے گا "اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا" یہ محبت مستلزم ہے تسخیر کی، جب تم خدا کے محبوب بن جاؤ گے پھر کسی چیز کی ضرورت نہیں رہے گی، "وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا، وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِیْلًا"۔

عزیزو! محنت کرلو، گھروں کو بھول جاؤ، کھانے اور لباس کے معیار کو بھول جاؤ، بس اپنے مقصد اور منزل کو پیش نظر رکھو، اگر تم صاحب کمال بن جاؤ گے، تو دنیا اور آخرت دونوں تمہاری ہو جائیں گی۔

خدا تم کو اس کی توفیق عطا فرمائے، کیونکہ یہ سب اسی کی توفیق پر منحصر ہے۔!!

پاکیزہ ذوق، علم و مطالعہ کی کنجی ہے

مولانا محمد اویس ندوی نگرامیؒ، شیخ التفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماءؒ کی تحریک اور کوشش سے دارالعلوم میں توسیعی خطبات کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا، اس سلسلے کا آغاز ۴ مئی ۱۹۶۷ء کو ہوا، جلسہ کی صدارت مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی نے فرمائی اور مولانا محمد اویس صاحب ندوی کی تعارفی تقریر کے بعد مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اس سلسلہ کا آغاز کرتے ہوئے حسب ذیل تقریر فرمائی، اس تقریر کو سید شرافت علی متعلم درجہ فضیلت سال آخر نے مرتب کیا ہے۔

پاکیزہ ذوق، علم و مطالعہ کی کنجی ہے

نصاب تعلیم کا دائرۂ عمل

ہمارے نصاب تعلیم کا یہ ایک اہم مسئلہ ہے کہ یہ نصاب اپنی خوبیوں اور امتیازات کے باوجود دیگر ضروریات کو مکمل نہیں کرتا، کوئی ایسا شخص جو ذمہ دار اور حقیقت پسند ہو یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہمارا نصاب تعلیم زندگی کی تمام ضروریات پر حاوی ہے، ہمارا نصاب تعلیم بھی اس کا مدعی اور ضامن نہیں، نصاب تو درحقیقت اس ملکۂ خاص کا ضامن ہے جو انسان کی زندگی میں قدم قدم پر رہنمائی و قیادت کا کام انجام دے سکے اور انسان کے اندر اتنی استعداد پیدا کردے کہ وہ کتابوں سے فائدہ اٹھا کر نتائج اخذ کر سکے، وہ زندگی کے تمام تقاضوں اور ضروریات کی تکمیل کا ضامن نہیں ہوتا، قدیم نصاب تعلیم نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا، اگرچہ ہمارے نصاب میں ملکہ پیدا کرنے کی خصوصیت ہے لیکن زندگی کے ہر مرحلے میں ہر انسان کی صحیح رہنمائی کر سکے اس کا وہ بھی مدعی نہیں، آج ماہرین تعلیم کے سامنے یہ مسئلہ بڑا اہم ہے کہ نصاب تعلیم کے علاوہ طلباء کے لئے ایسی کیا چیز مہیا کی جائے، جو زندگی اور منصب و مرتبے۔ کے تقاضوں کو پورا کرے، اور جس ماحول میں ان تقاضوں کی تکمیل ہوتی ہو اس ماحول سے صحیح رابطہ پیدا کر سکے، یہ مسئلہ مغرب کے دانشوروں سے لے کر مشرق کے عالموں تک سب کے لئے ایک اہم اور

مسئلہ بن گیا ہے۔

ذوق کیسے پیدا کیا جائے؟

ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ طلباء کے لئے کتب خانے مہیا کئے جائیں اور پھر اساتذہ کتابوں کے مطالعہ میں طلباء کی رہنمائی کریں تاکہ طالب علم زندگی کے کارواں سے بچھڑنے نہ پائیں، اور جب وہ کسی کتاب کا مکمل مطالعہ کرلیں اور اس پر حاوی ہو جائیں تو ان کو زندگی سے اجنبیت محسوس نہ ہو، ایک راستہ یہ ہے کہ طلبا کو وقتاً فوقتاً ایسے ماہرین تعلیم اور علم و فن کے فضلاء مہیا کئے جائیں جو ان کے سامنے نئے زاویئے اور نئے حقائق پیش کریں، اور قدیم علمی معلومات کے علاوہ جدید علوم کے حقائق سے طلباء کو آشنا کریں، اس طریقے کو ہمارے ملک میں بھی آزمایا جا رہا ہے، یہ سلسلہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اور مشرق وسطیٰ کے علمی مرکزوں میں بھی رائج ہے، اور حقیقت میں یہ بات انتہائی لائق تحسین و توصیف ہے کہ مشاہیر علم و فن یہاں آکر اپنے خطبات و مقالات سے علم و تعلیم کا نچوڑ آپ کے سامنے پیش کردیں، اور آپ بھی اہل علم کی مجلسوں اور محفلوں میں شریک ہوں، کیوں کہ علم و فن کا ذوق جب ہی بنتا ہے، جب اہلِ علم کی مجلسوں سے ربط قائم رکھا جائے، اس کے بعد انسان بہت تھوڑے مواد سے کام لے سکتا ہے، لیکن ایسا ملکہ جب ہی پیدا ہوگا جبکہ مختلف مجالس اور محافل میں شرکت کی جائے، یہ سب باتیں وہی سمجھ سکتا ہے، جو علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کی محفلوں میں شریک ہوا ہو، ــــــــــــ

ــــــــــــ مولانا سید سلیمان ندوی علامہ شبلی کی مجلسوں میں شریک ہوتے رہے، اور ان کے چشمۂ علم سے سیراب ہوتے رہے، اور اس کی وجہ سے ان میں وہ شعور اور ذوق

اور ملکہ پیدا ہو گیا جو بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔

ذوق کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کے سامنے کوئی شعر پڑھا جائے تو آپ اپنے ادبی ذوق سے یہ بتلا دیں کہ یہ فلاں کا شعر ہے، ایسا نہ ہو کہ آپ کے سامنے انیسؔ و دبیرؔ کے اشعار پڑھے جا رہے ہوں اور ان کو آپ غالبؔ و ذوقؔ کی طرف منسوب کریں، یا مومنؔ کا شعر ہو اور آپ اس کو کسی اور کا سمجھ رہے ہوں، لیکن یہ سب باتیں مختلف مجلسوں میں شرکت کے بعد پیدا ہوں گی۔

ہمارے لئے یہ بات افسوس ناک ہو گی کہ ہم اس تیز رفتار دور میں طبیعیات، سائنس وغیرہ کی ابتدائی معلومات سے بھی ناآشنا ہوں جو اس دور میں لازمی اور ضروری ہے، بلکہ اخبارات و رسائل کے سمجھنے کے لئے ان کا علم ناگزیر ہے، اس کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ ہم اس قسم کی محفلوں میں شریک ہوں اور معلومات حاصل کریں۔

ایک مثال

انسان کے ذہن میں جب مراتب کا علم نہیں ہوتا اور وہ موٹی بات نہیں جانتا تو اس حیادار آدمی کے لئے شرفاء کی مجلس میں شریک ہونا بھی دوبھر ہو جاتا ہے، جب میں نوعمر تھا، اور میں نے "نزہۃ الخواطر" میں مشاہیر ہند کے حالات نہیں پڑھے تھے اس زمانے میں مولانا سلیمان اشرف صاحب کی مجلس میں شریک ہوا، اس مجلس میں مفتی یوسف صاحب کا ذکر آیا، تو اس تذکرے میں مجھ سے نہ رہا گیا، اور میں بول اٹھا کہ "مفتی صاحب مولانا عبدالحیٔ صاحب کے داماد تھے" تو مولانا سلیمان اشرف صاحب نے فوراً کہا "مولوی صاحب چپ رہو" اس وقت میری بہت سبکی ہوئی، لیکن اس سے عبرت حاصل کیجئے کیوں کہ ہو سکتا ہے، اس تذکرے میں مفتی یوسف صاحب سے اور کوئی مراد ہوں[1]، یہاں یہ سمجھئے کہ

[1] اس سے مراد مفتی یوسف بن اصغر فرنگی محلی مراد تھے، جو عہد شاہی میں بڑے مدرس اور مفتی تھے۔

اگر آپ کے سامنے مولانا سلیمان صاحب کا تذکرہ ہو تو کون مراد ہوگا، کئی سلیمان ہیں جو علم و فضل میں بہت ممتاز مقام رکھتے ہیں، اسی طرح قاضی مبارک کا تذکرہ ہو، اور کسی کو نہ معلوم ہو کہ قاضی مبارک تین ہیں، اب وہ اس محفل میں بول اٹھے تو کتنی سبکی ہوگی، اور شرم و ندامت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

میں نے علماء کی چند ہی ایسی مجالس دیکھی ہیں، جہاں خالص علمی گفتگو ہوتی تھی، شروع سے آخر تک تذکرہ ہوتا تو علم ہی کا ہوتا تھا مولانا سید سلیمان ندوی کی مجلس، شاہ حلیم عطا صاحب کی مجلس اور علامہ اقبال کی مجلسیں، اگرچہ علامہ اقبال کی مجلس میں صرف دو مرتبہ شریک ہونے کا اتفاق ہوا، مجھے بہت خوشی ہوگی کہ ایسے اہل کمال یہاں آئیں جو اپنے جگر کو آپ کے سامنے نکال کر رکھ دیں اور علم کا نچوڑ پیش کردیں لیکن اس کے بعد بھی اگر آپ میں کوئی تغیر نہ ہوا اور آپ کی زندگی میں کوئی انقلاب نہ آئے تو یہ بہت بڑی بدنصیبی اور بدنامی کی بات ہے۔

اگر یہاں تاریخ اور علوم اسلامیہ کے ماہرین کو بلایا جائے تو میرا خیال یہ ہے کہ علوم جدیدہ کے ماہرین کو بھی دعوت دی جائے جو فزکس، طبیعیات اور فلکیات وغیرہ پر آپ کے سامنے تقریر کریں۔ اسی طرح ادبی ذوق کی نشو و نما کے لئے ادیبوں اور شاعروں کو بھی دعوت دی جائے۔

——— یہ زمانہ اختصاص کا ہے، آپ کو تمام ایسی معلومات ہونی چاہئیں کہ آپ یونیورسٹی کے طلباء تو کیا اگر وہاں کے پروفیسروں کے سامنے بیٹھیں تو بے تکلفی سے گفتگو کرسکیں، اور ان کے پاس بیٹھنے میں اجنبیت یا ہچکچاہٹ محسوس نہ کریں، "الاصلاح" بھی اسی لئے ہے کہ آپ کے اندر ذوق علم پیدا ہو، اس "الاصلاح" کے فائدے کا بڑے بڑے لوگوں نے

اقرار کیا کہ اس نے ہم کو سب کچھ دیا، مولانا نے کتابوں کے مطالعے کے متعلق فرمایا کہ انتخاب بھی بہت بڑی چیز ہے، مطالعہ کے لئے انتخاب کے ساتھ مولانا نے ان مجلسوں میں شرکت کے فائدے کو بیان کرتے ہوئے شعر پڑھا کہ ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

پھر فرمایا کہ دینی ذوق بھی اسی طرح بنتا ہے کہ آپ اہل اللہ کے پاس بیٹھیں، مولانا نے فرمایا کہ ذوق کی تشریح نہیں کی جاسکتی، یہ تو خدا جس کو دیتا ہے، وہی سمجھ سکتا ہے، ہر چیز کا ایک ذوق ہوتا ہے، جو صرف اہلِ ذوق سے پیدا ہوتا ہے، ذوق ہر چیز کا بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے، آج حیات انسانی کا ذوق مفقود ہے، صاف ستھری پاکیزہ زندگی گذارنے کا ذوق بھی مفقود ہے، امریکہ اور یورپ اپنی عروج و ترقی کی منزلوں کے باوجود انسانی زندگی کا ذوق پیدا نہیں کرسکے، آج بھی وہاں مشینوں کی کثرت کے باوجود انسان کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے، اور اس کو مرکزی اہمیت حاصل ہے، خوب یاد رکھئے کہ یہاں جو آپ کے اساتذہ ہیں، انھیں سے آپ کا کام چلے گا، انھیں ٹمٹماتے ہوئے چراغوں سے آپ کا چراغِ زندگی روشن ہوگا، انھیں سے آپ اپنے دل کا چراغ منور کریں گے، آپ یہ چاہیں کہ کسی اور طریقے سے یا دوسرے چراغوں سے اپنی زندگی اور دل کے چراغ روشن کرلیں تو یہ ناممکن ہے۔

اعتماد، اعتقاد اور اتحاد

خوب سمجھ لیجئے کہ ان ہی اساتذہ کی محفلوں میں شرکت کرکے آپ صحیح ذوق و شوق پیدا کرسکتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ آپ اعتماد اور ایک حد تک اعتقاد اور اتحاد کے ساتھ

بیٹھیں، یاد رکھئے کہ مخلص و غیر مخلص اچھے اور برے بلکہ انسان اور غیر انسان کا فرق سمجھنے کے لئے کہیں بھی اصول و ضوابط منضبط نہیں ہوتے بلکہ یہ بات صرف ذوق ہی سے معلوم ہوتی ہے۔

آج تمام مدارس میں ایک خلا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اساتذہ اور طلبا میں ربط نہیں ہے، بلکہ ان کے درمیان ایک خلیج حائل ہے، اور وہ صرف درس کے اساتذہ اور درس کے طلبا رہو کر رہ گئے ہیں، اس خلا کو پر کردینے کی اور اس خلیج کو پاٹنے کی ضرورت ہے، اس میں مدارس کی کامیابی و ترقی مضمر ہے۔

زمانہ کا دامن پھیلتا اور سمٹتا رہتا ہے

آج ہمیں پہلے سے کہیں زیادہ محنت، تیاری

اور

سرمایۂ علم کی ضرورت ہے

جمعیۃ الاصلاح کے افتتاحی جلسہ میں
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
کی تقریر

زمانہ کا دامن پھیلتا اور سمٹتا رہتا ہے

آج ہمیں پہلے سے کہیں زیادہ محنت، تیاری، اور سرمایۂ علم کی ضرورت ہے

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔

عزیزو! دارالعلوم کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ یہاں سے طالب علم جس وقت فارغ ہو کر نکلے تو وہ باہر کی دنیا کے لئے اجنبی نہ ثابت ہو۔

ایسا نہ ہو کہ یہ مدّت جو دارالعلوم کے اندر گذاری ہے، وہ ان کی باہر کی دنیا سے بالکل علیحدہ ہو بلکہ یہاں رہتے ہوئے بھی باہر کے جھونکے اندر آتے رہیں، وہ روزن اور کھڑکیاں کھلی رہیں، جن سے ہم باہر کی دنیا کو دیکھ سکیں۔

"الاصلاح" کا قیام ایک جرأت مندانہ اقدام تھا

جس وقت دارالعلوم قائم ہوا اس وقت ہمارے قدیم عربی مدارس میں تدریس کے لئے ایک خاص طرح کی زبان مستعمل تھی، اور اظہار خیال کے لئے بھی ایک مخصوص اسلوب اور طرز تحریر رائج تھا، یہ قدیم نصاب تعلیم کا قدرتی نتیجہ تھا، اس کے الفاظ اور اس کی تعبیرات، اس کے محاورے، اور اظہار خیال کے طریقے تمام اس طرز تعلیم سے متاثر تھے، جو اس زمانے میں رائج تھا، اس زمانے کے

مدارس میں اخبارات و رسائل پڑھنے کا بھی کچھ زیادہ رواج نہیں تھا، بلکہ شاید اخبارات اور رسائل کا مطالعہ کسی درجہ میں معیوب سمجھا جاتا تھا، جو لوگ اخبار و رسائل پڑھتے تھے وہ مطعون کئے جاتے تھے، اور ان کی انگشت نمائی ہوتی تھی کہ یہ تعلیم کا حرج کرکے اخبار و رسائل دیکھتے ہیں، اس وقت دارالعلوم میں طلباء کی ایک ایسی انجمن قائم کرنا جس کا ایک دارالمطالعہ ہو اور دارالاخبار ہو جس میں ہفتہ وار خطابت کے جلسے ہوتے ہوں اور اس کا نظم و نسق سب طلبہ کے ہاتھ میں ہو، ایک بڑا حقیقت پسندانہ اور جرأت مندانہ اقدام تھا، آج تو یہ چیز ہماری زندگی میں ایسی گھل مل گئی ہے اور ایک ایسے سکۂ رائج الوقت کی طرح ہو گئی ہے جس میں کسی قسم کی کوئی ندرت یا جدت نظر نہیں آتی، لیکن آج سے ستّر برس پہلے اس گذشتہ صدی کے بالکل آخر میں جب دارالعلوم قائم ہوا اور ہمارے ابنائے دارالعلوم نے جن کا نام اکثر کتابوں میں مل سکتا ہے انجمن الاصلاح قائم کی، اس وقت اس اقدام کی بڑی اہمیت تھی، اور اس میں بڑی جدّت تھی، اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے وہ زمانہ دیکھا ہو، اس زمانہ کے لحاظ سے یہ ایک بڑا مفید قدم تھا، اور کوئی شبہ نہیں کہ اس زمانہ میں انجمن الاصلاح نے بڑا مفید کام انجام دیا اور اس کے بعد سے لے کر اس وقت تک مفید کام انجام دیتی رہی اور اس میں بہت سے ایسے لوگوں کی تربیت ہوئی جنھوں نے یہاں سے نکل کر اپنی اس مشق اور مہارت سے بہت فائدہ اٹھایا، اس لحاظ سے دارالعلوم کے ان فرزندوں اور "الاصلاح" کے بانیوں کو جتنی بھی داد دی جائے اور ان کی خدمات کو جتنا بھی سراہا جائے کم ہے۔

آج زمانہ بہت بدل چکا ہے

لیکن میرے عزیزو! زمانہ میں ہر چیز کی قدر و قیمت اس زمانے کی ضروریات اور اس زمانے کے معیار کے لحاظ سے ہوتی ہے جس زمانہ میں یہ قدم اٹھایا گیا تھا، اس زمانہ میں یہ علماء کی روشن خیالی

کا ایک بہت بڑا ثبوت تھا، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ادارہ کو اس میں اولیت حاصل ہے لیکن اس کے بعد سے زمانہ بڑا سرگرم سفر رہا ہے، وہ ایک منٹ کے لئے جامد و ساکت نہیں ہوا اس نے کسی منزل پر قیام نہیں کیا، خیالات بدلتے رہے، ضروریات بدلتی رہیں، تقاضے بدلتے رہے، نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہے، نئے نئے میدان اور نئے نئے چیلنج سامنے آتے رہے، اور علماء سے اپنے جوابات مانگتے رہے، اب اس زمانہ میں اخبارات و رسائل کا مطالعہ یا کسی بزم کا قیام ایک ایسی عام چیز ہو گئی ہے کہ اس سے کوئی چھوٹے سے چھوٹا مدرسہ بھی اس وقت مشکل سے خالی ہوگا، گاؤں گاؤں قصبے قصبے ایسی انجمنیں قائم ہیں، جہاں تقریروں کی مشق کرائی جاتی ہے، لوگوں نے خاندان برادری کی سطح پر بہت سی انجمنیں.... قائم کر رکھی ہیں، اور عربی مدارس میں بھی عام طور پر ایسی انجمنیں جمعیتیں پائی جاتی ہیں، بعض مدارس میں تو میرے خیال میں کئی درجن انجمنیں ہوں گی، یہاں تک کہ ضلع وار بھی انجمنیں قائم ہیں، اب زمانہ ان چیزوں سے بہت آگے بڑھ گیا ہے، اب سلجھی ہوئی تقریر کرنا، یا ان اخبارات و رسائل کا پڑھ لینا، اور اس بات سے واقف ہونا کہ کہاں کہاں سے یہ اخبارات و رسائل نکلتے ہیں، اور ان میں کیا لکھا جاتا ہے، یا ایک شستہ تقریر کر لینا، ایک رواں مضمون لکھ دینا، اپنے خیالات کو شائستہ انداز میں ادا کر لینا کافی نہیں رہا، اس میں کسی قسم کا امتیاز باقی نہیں رہا، اب یہ چیزیں دور ماضی کی ایک یادگار ہیں، اور اس توقع پر قائم ہیں، اور ان کو قائم رکھا جاتا ہے، اور ہمت افزائی کی جاتی ہے کہ شاید ان میں وسعت پیدا ہو اور یہ زمانہ کے نئے تقاضوں کی تکمیل کر سکیں، ورنہ جہاں تک کسی بزم خطابت کا تعلق ہے کسی دارالاخبار کا تعلق ہے، ان میں کوئی جدت اور کوئی فوقیت باقی نہیں رہی۔

متوسط درجہ کی لیاقت کافی نہیں

ایک زمانہ تھا، جب علماء کا شستہ اردو لکھ لینا اور اس زمانہ کے محاورہ اور اسلوب کے

مطابق تصنیف و تالیف کر لینا بڑی قابل تعریف بات سمجھی جاتی تھی، بہت سے علماء اپنے خیالات کے ادا کرنے پر پوری قدرت نہیں رکھتے تھے، اور نئے خیالات کے لئے قدیم زبان ہی استعمال کرتے تھے، لیکن یہ چیزیں اب بہت عام ہو گئی ہیں، ندوۃ العلماء کا قیام جس زمانہ میں ہوا اس زمانہ میں کسی ندوی فاضل کا کسی تاریخی موضوع پر کچھ لکھ دینا یا اس میں قدیم ماخذ میں سے تمام ضروری اور متعلق مواد جمع کرنا اور سلیقہ کے ساتھ اس کو ترتیب دینا ایک بڑا علمی کارنامہ سمجھا جاتا تھا، اس وقت کسی فاضل کے لئے یہ بات بس تھی کہ اس نے مسلمانوں کی تہذیب کے کسی پہلو، مسلمانوں کے کسی علمی کارنامے، مسلمانوں کی کسی تہذیبی و تمدنی خدمت یا کسی دور حکومت یا کسی مسلمان حکمراں خاندان پر ایک ایسی متوسط درجہ کی کتاب لکھ دی جس میں اگرچہ کوئی ریسرچ یا کوئی خاص قسم کا نظریہ ثابت نہ کیا گیا ہو، تاہم سلیقہ کے ساتھ اس کا مواد جمع کر دیا گیا ہو، یا پڑھنے والوں کو اس سے وحشت نہ ہوتی ہو، یہ بات کسی قدیم درسگاہ کے افتخار کے لئے اس وقت بہت کافی تھی۔

لیکن میرے عزیزو! اب حالات بہت مختلف ہو چکے ہیں، اگر ہماری انجمن کا مقصد یہی ہے کہ متوسط درجے کے خطیب اور مقرر پیدا کرے، ہمارے طلباء اخبارات و رسائل سے ناواقف نہ رہیں اور ان کو یہ معلوم ہو کہ اس زمانے میں کیا رجحانات کام کر رہے ہیں، اس زمانے میں کون ادیب اور کون مصنف ہے، اور کون کون صاحب طرز اہل قلم، تو یہ بات بالکل ناکافی ہے۔

زمانہ کا دامن سمٹتا اور پھیلتا رہتا ہے

زمانہ اب اس سے بہت زیادہ کا طالب ہے، زمانہ کا دامن سمٹتا اور پھیلتا ہے، زمانہ کی جھولی اور اس کا کشکول گدائی ایک ناپ کا نہیں رہتا، وہ حالات کے مطابق، لوگوں کی استعداد کے مطابق، نئے سیاسی تغیرات اور تبدیلیوں کے مطابق، ہر دور میں ہر جماعت سے

اپنے زمانہ اور پیمانہ کے مطابق رہنمائی اور رہبری کا طالب ہوا کرتا ہے، اب یہ زمانہ اس بات کا بالکل متحمل نہیں ہے اور محض اس پر دینی درسگاہ کے طالب علم کو کسی قسم کا کوئی تصدیق نامہ دینے کے لئے تیار نہیں ہے کہ اس میں کچھ اچھے بولنے والے پیدا ہو جائیں کچھ متوسط درجے کے لکھنے والے پیدا ہو جائیں۔

آج پہلے سے کہیں زیادہ تیاری کی ضرورت ہے

اس وقت جو ایک عام ذہنی انتشار اور ایک قسم کی مایوسی ملت پر پھیل رہی ہے اور ملت کی صلاحیت کی طرف سے اور دین میں جو صلاحیت ودیعت کی گئی ہے، اس صلاحیت کی طرف سے یا دین کے مستقبل کی طرف سے جو بدگمانی اور بے اعتمادی پیدا ہو رہی ہے، نوجوانوں میں جدید تعلیم یافتہ طبقوں میں اور حاملین دین میں، جو بے اعتمادی پھیل رہی ہے، اس کو دور کرنے کے لئے بہت زیادہ تیاریوں کی ضرورت ہے، اس سے بہت زیادہ علمی فتوحات حاصل کرنے کی ضرورت ہے، اس سے بہت زیادہ بلند پروازیوں کی ضرورت ہے، اس سے بہت زیادہ کاوشوں، دلسوزیوں اور دماغ سوزیوں کی ضرورت ہے، جو ہمارے اسلاف نے کیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ندوۃ العلماء کے صفِ اول کے مصنفین اور اہل قلم نے اس زمانے کی نسلوں کو بہت کچھ دیا، انھوں نے اس زمانے کی نسل کو بڑی حد تک مطمئن کرنے کی کوشش کی، جو مسائل اس عہد میں اہمیت رکھتے تھے، ان مسائل پر انھوں نے جو چیزیں پیش کیں، وہ اس زمانے کے لحاظ سے بہت طاقتور اور دل نشین تھیں، لیکن اگر آج ان چیزوں کو دہرایا جائے یا بالکل ان کی نقل کی جائے تو اس میں کوئی علمی استدلال نہیں ہوگا، اور لوگوں کو بڑی مایوسی ہوگی۔

تحقیق و مطالعہ کا میدان بہت وسیع ہے

تحقیق اور مطالعہ کا میدان بہت وسیع ہو چکا ہے، قدیم ذخیرے بلکہ قدیم دفینے جو پہلے

علماء کے خواب و خیال میں بھی نہیں آتے تھے، اب عام ہو چکے ہیں، نشر و اشاعت کے اداروں نے اور طباعت و اشاعت کی تحریک نے زمین کے جگر چاک کر دیئے ہیں، اور سمندروں کے اندر سے موتی نکالے ہیں، وہ چیزیں جن کا ہم صرف نام سنتے تھے، وہ آج بازاروں میں مل رہی ہیں، سوچنے کے طریقے اور مطمئن کرنے کی صلاحیت اتنی مختلف ہو گئی ہے کہ ان میں قدیم طرز کی بالکل تقلید نہیں کی جا سکتی۔

بہت سے قدیم مباحث آج اپنی اہمیت کھو چکے ہیں

ایک زمانہ تھا کہ مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الجزیۃ فی الاسلام" معرکۃ الآراء کتاب سمجھی جاتی تھی، "اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر" گویا علمی فتح تھی، اسی طریقے سے ان کا "کتب خانہ اسکندریہ" بڑی محققانہ کتاب یا یوں سمجھئے کہ اسلام کی طرف سے ایک حجت تھی، لیکن آج یہ مباحث اپنی اہمیت اتنی کھو چکے ہیں کہ اگر ان مباحث پر لکھا جائے تو اس میں لوگوں کے لئے کوئی نئی بات اور دلچسپی نہ ہوگی، اس زمانے میں اس سے بہت زیادہ وسیع علم اور اس سے بہت زیادہ محنت و کاوش کی ضرورت ہے۔

زمانہ آسانی کے ساتھ کسی کو تسلیم نہیں کرتا

یہ علمی معیار بھی ہمارے لئے یقیناً قابلِ احترام ہے، اس کے ساتھ بہت عزیز یادیں اور یادگاریں وابستہ ہیں، یہ ہماری تاریخ کا ایک جزء ہے، لیکن زمانہ بڑا بے رحم ہے، اور بڑا بے مروت واقع ہوا ہے، وہ بڑی سے بڑی مقدس جماعت کے ساتھ بھی مروت نہیں کرتا، وہ کسی کے سامنے آسانی کے ساتھ سرِ تسلیم خم نہیں کرتا، زمانہ کی فطرت ہے کہ جب تک اس کو اعتراف پر مجبور نہ کر دیا جائے، وہ کسی کا اعتراف نہیں کرتا، کسی چیز کا تسلسل زمانہ کے لئے بالکل کافی نہیں ہے، زمانہ ایسا

حقیقت پسند، ایسا بے مروت، اتنا غیر جانبدار ہے کہ جب تک اس کے ہاتھ میں کوئی نئی چیز نہ دی جائے اور اس کی گردن کو کسی بوجھ سے ایسا بوجھل نہ کر دیا جائے کہ وہ جھکنے پر مجبور ہو جائے اس وقت تک وہ جھکنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، زمانہ سے کسی قسم کا اقرار کرا لینا کسی قسم کی سند حاصل کرنا، کوئی تمغۂ امتیاز یا خراج عقیدت حاصل کرنا، بچوں کا کھیل نہیں ہے، اور محض روایت پر مبنی اس کے لئے کافی نہیں ہے، زمانہ کو اعتراف پر مجبور کرنے کے لئے اپنی فوقیت کا نقش قائم کرنے کے لئے اپنے ادارے کا احترام دلوں اور دماغوں میں پیدا کرنے کے لئے اپنے لئے مناسب اور شایان شان مقام حاصل کرنے کے لئے آپ کو بڑی جدوجہد کرنا پڑے گی، آپ کو اپنا معیار بلند کرنا پڑے گا، اس زمانہ میں اگرچہ علم نے بڑی ترقی کی ہے، اور اس میں بہت سے نئے میدان پیدا ہو گئے ہیں، اور اس کی اہمیت و وسعت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، لیکن اسی کے ساتھ علمی زندگی کی مشکلات کچھ ایسی ہیں، زمانہ نے ایسی نئی کروٹ لی ہے، اور ایسے انقلابات ملک میں پیش آچکے ہیں کہ اب محض علم کی وسعت، تحریر کی شگفتگی، خیالات کی بلندی، اور نظریات کی جدت، کافی نہیں ہے، اب اس کے ساتھ بلند کردار کی اور درد مند و پُرسوز دل کی بھی ضرورت ہے۔

آپ شاید میرے الفاظ کو بے محل سمجھیں گے اور کہیں گے کہ یہ زمانہ یا حقیقت کی ترجمانی نہیں ہے، اس لئے کہ زمانہ ان تمام قدروں سے باغی ہوتا چلا جا رہا ہے، جو ہم کو عزیز تھیں، جن کو مذہب نے پیش کیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ آپ دیکھیں گے کہ بجائے اس کے کہ شخصیت سے عمل سے، کردار سے، زمانہ کی مرعوبیت ختم ہو، بڑھتی چلی جا رہی ہے، ہر انقلاب کے پیچھے آپ کو کوئی ایسی شخصیت نظر آئے گی جس نے رفقاء کی بڑی تعداد کو متاثر کیا، ان کے افکار و خیالات پر اثر ڈالا اور ایک نئی ذہنی رو پیدا کی، اور اس کی وجہ سے واقعات اور تغیرات کا ایک نیا دھارا نمودار ہوا۔

یقین کی طاقت

ہر انقلاب کے سرے پر جہاں سے اس انقلاب کا چشمہ پھوٹتا ہے، جہاں سے انقلاب کا سیل رواں آگے بڑھتا ہے، آپ کو ایسی شخصیت نظر آئے گی جس کے اندر کسی چیز کا یقین دل و دماغ کی تہ میں پیوست ہے، اور تمام اعصاب پر پوری طرح حاوی ہے، جس کے اندر ایک ایسی مقناطیسی اور برقی قوت موجود ہے جو سیکڑوں اور ہزاروں کو متاثر کرتی ہے، محض خطابت سے، دو چار اچھی تصنیفات سے، قلم کی روانی سے، خیالات کے سلجھاؤ سے، کسی نادر علمی تحقیق سے، محض کسی نئے طرز میں کسی پرانے خیال کو یا نئے جام میں کسی شراب کہن کو پیش کرنے سے زمانہ میں کوئی نیا انقلاب اور انقلاب تو بڑی چیز ہے، کوئی معمولی تبدیلی بھی پیدا نہیں ہوسکتی، اس زمانے میں ضرورت ہے کردار کی، قلب کی دردمندی اور اندرونی سوز کی، ایک ایسی حرارت کی جو اندر اندر جلا رہی ہو، اعصاب کو پگھلا رہی ہو، اور پھر یہ لاوا پھوٹ کر کوہ آتش فشاں کی طرح بڑھ رہا ہو، اور اس کی تپش اور سوزش سیکڑوں اور ہزاروں دلوں کو گرما رہی ہو۔

جہاں تک میرا مطالعہ ہے کم از کم اسلامی تاریخ کے حدود میں شاید کوئی انقلاب خالص خطابت اور طلاقت لسانی سے پیدا نہیں ہوا، اس زمانے کا بہت بڑا مسئلہ جس کی طرف میں آپ کو اجمالی طور پر متوجہ کرتا ہوں بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں اشارہ کرنا چاہتا ہوں جس کو علامہ اقبال نے چھیڑا تھا۔

انھوں نے کہا کہ زمانہ کا مجدد کہلانے کا مستحق وہ ہوگا جو اسلامی شریعت کی برتری ثابت کرے اور زندگی سے اس کا پیوند لگائے اور یہ ثابت کرے کہ اسلامی قانون وضعی قانون اور انسانوں کے تمام خود ساختہ قوانین سے آگے ہے، وہ زمانے کے آگے کی چیز ہے، زمانہ اس سے آگے بڑھ نہیں سکا اور دنیا نے خواہ کتنی ہی ترقی کی ہو، لیکن اسلامی قوانین اس کی رہنمائی کی اب بھی صلاحیت رکھتے ہیں، اس کے

تمام سوالات کے جوابات دیتے ہیں، اور انسانی زندگی کے پیدا ہونے والے مسائل کا ان کے اندر حل ہے، ان میں ایک بالغ معاشرے کی تنظیم کی بہترین صلاحیت ہے، انھوں نے اس سوال کو اٹھایا تھا، اور ان کی بڑی تمنا تھی کہ وہ اس کا جواب دیں، وہ اس سلسلہ میں ہمارے مولانا سید سلیمان ندوی سے بڑی مدد کے طالب تھے، جیسا کہ انھوں نے اپنے خط میں لکھا ہے، علوم اسلامیہ کے جوئے شیر کا فرہاد مولانا سید سلیمان ندوی کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے، جو علامہ شبلی کے صحیح جانشین ہیں، آج بھی یہ سوال اسی طریقے سے زندہ ہے، اور جواب چاہتا ہے، اسلامی قانون کی برتری ثابت کرنے کے لئے علماء کو میدان میں آنا چاہیے۔

سب سے بڑا معرکۂ افکار

اسی طریقے سے اس وقت جو سب سے بڑا فیصلہ کن معرکہ عالم اسلام میں درپیش ہے، اور جس میں بہت سے ممالک آزمائش کے دور سے گذر کر اس غلط منزل پر جا پہونچے ہیں، جس کے تصور سے بھی ہمارے اسلاف کی نیند حرام ہوتی ہوگی، اور بہت سے ممالک اب اس منزل کی طرف بہت تیزی سے گامزن ہیں وہ ہے "اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش کا مسئلہ" اس وقت اس طبقے کے درمیان جس کے ہاتھ میں زمام حکومت ہے، اور سواد اعظم اور عامۃ المسلمین کے درمیان ایک بہت بڑی ذہنی کشمکش برپا ہے، اس وقت جس طبقے کے ہاتھ میں زمام کار آئی ہے، وہ مغربی تہذیب کو مثالی اور انسانی تجربات کی آخری منزل اور حرف آخر سمجھتا ہے، وہ اس کو زندگی کی تنظیم کی آخری کوشش سمجھتا ہے، اور انسانی مسائل کے حل کا آخری کامیاب تجربہ سمجھتا ہے، اور اس کو اسلام کے نظام کا قائم مقام خیال کرتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اسلام کا نظام اپنی ساری افادیت کھو چکا ہے، اب اس کو دوبارہ اس کارگاہ میں لانے کی زحمت دینا صحیح نہیں ہے، یہ ہے وہ زندہ سوال جو اس وقت ایک شعلہ کی طرح، ایک بھڑکی ہوئی

آگ کی طرح تمام اسلامی ممالک میں پھیل چکا ہے، اور جس کے اثر سے کوئی طبقہ اور کوئی پڑھا لکھا انسان پورے طور پر محفوظ نہیں ہے۔

آج کا تجدیدی کام

اس وقت سب سے بڑا تجدیدی کارنامہ اور میں سمجھتا ہوں کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا سب سے بڑا مقصد گویا اس کا وجہ جواز، اس کی افادیت کا سب سے بڑا ثبوت اور اس کے اسلاف کی کوششوں کا سب سے بڑا پھل نیز ان کی محنتوں کا اور ان کی قربانیوں کا سب سے بڑا مطالبہ یہ ہے کہ ندوہ کے فضلاء اسلامی ممالک میں یا غیر اسلامی ممالک میں جہاں کہیں بھی ہوں، اس کا ایسا جواب دینے کی کوشش کریں جو لوگوں کو مطمئن کرسکے، اور مغربی فلسفہ کا وہ اثر کم کرسکے جو اس وقت پورے عالم اسلام پر اپنا سایہ ڈال چکا ہے، آج ان ملکوں میں اسلام کی اور مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ کیا جارہا ہے، اور تمام اسلامی ملک کم و بیش اس مسئلہ سے دوچار ہیں۔

یہ چیلنج قبول کیجئے

یہ وہ چیلنج ہے جسے آپ کو قبول کرنا ہے، اسی کے معیار کے مطابق اپنے آپ کو تیار کرنا ہے، اس وقت آپ کو اپنی ذہانت کا ثبوت دینا ہے، اور علم کا وہ نمونہ اور معیار سامنے لے کر آنا ہے، جو زبان کے اعتبار سے، اسلوب کے اعتبار سے، مواد کے اعتبار سے، مطالعۂ مذاہب اور تقابل ادیان کے اعتبار سے متوجہ کرنے والا ہو جس کو دیکھ کر زمانہ خود اس بات کا اعتراف کرے کہ آپ نے ایسی چیز سامنے رکھی ہے، جو واجب الاعتراف ہے۔

آج زمانہ زیادہ اہم چیزوں کا طالب ہے

میں اس بات کو پھر دہراؤں گا کہ زمانہ اب آپ سے بہت سی نئی چیزوں کا طالب ہے،

ان چیزوں سے بہت زیادہ نازک اور اہم چیزوں کا طالب ہے، جن کا وہ ہمارے اسلاف سے طالب تھا۔ اقبال کا شعر ہے ؎

نگہ بلند سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

اب اس سخن میں دلنوازی بھی نہیں رہی لیکن سخن دلنواز بھی کافی نہیں، اس کے ساتھ جانِ پرسوز اور نگاہِ بلند بھی ہونی چاہیے، آپ جن کی طرف اپنا انتساب کرتے ہیں، اور جن کی اس عزیز میراث کے وارث ہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ وہ آسمان سے تارے توڑ لائے، لیکن اس زمانے کے مذاق اور معیار کے مطابق انھوں نے اپنی شان قائم رکھی، اور اس میں انھوں نے ایک مقام حاصل کیا، پھر اس مقام کو انھوں نے اپنی نسلوں کی طرف منتقل کیا، اب آپ کو اس کے لئے بہت زیادہ محنت کرنی پڑے گی، آپ تقریروں کا معیار بلند کیجئے، تحریروں کا معیار بلند کیجئے، مطالعہ وسیع کیجئے، اور اس کے لئے اساتذہ سے، خاص طور پر مربی الاصلاح سے اور ان اساتذہ سے جن سے آپ کا رابطہ ہے، ان سے مشورہ کیجئے، مطالعہ اتنا آسان نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے بغیر کسی ترتیب کے پڑھنا شروع کردے یہ دودھاری تلوار ہے، اگر اس کا صحیح استعمال نہیں کیا جائے گا تو وہ نقصان بھی پہونچا سکتی ہے، یہ ایک پُل صراط ہے، اس پر بہت سبک روی اور بہت احتیاط کے ساتھ چلنے کی ضرورت ہے، اس کے لئے اپنے اساتذہ سے مشورہ کیجئے، وقت بہت کم کام بہت زیادہ، پڑھنے کا سامان بھی روز بروز بڑھتا چلا جارہا ہے، نہ ہر لکھی ہوئی اور چھپی ہوئی چیز... پڑھنے کے قابل، نہ ہر رسالہ آپ کی میز پر آنے کے لائق۔

یہ علم کا، تہذیب کا، خیالات کا اور مقاصد کا حرم ہے

یہ علم کا، تہذیب کا، خیالات کا اور مقاصد کا ایک حرم ہے، اس حرم میں انھیں چیزوں کو

آنا چاہئے، اور ان چیزوں کو آنے کی اجازت دینی چاہئے جو آپ کے مقاصد سے مطابقت رکھتی ہوں، جو اس درسگاہ کے بانیوں کے مقاصد سے مطابقت رکھتی ہوں، جس طرح آپ یہاں کسی بدبودار چیز کو نہیں آنے دے سکتے اسی طریقے سے آپ کی میز پر کوئی ایسا رسالہ بھی نہیں آنا چاہئے، جو اس سے زیادہ متعفن اور مضر ہے، اور یہاں کی فضا کو اس سے زیادہ متاثر کر سکتا ہے۔

یہ میز کسی پبلک لائبریری کی میز نہیں ہے، یہ ایک درسگاہ کی میز ہے، یہ ایک معمل ہے، ایک بہت بڑی کارگاہ ہے، جہاں ان دماغوں کو ڈھلنا ہے، جو امت کی رہبری کریں گے، یہاں کی الماریوں میں کسی ایسی کتاب کو رہنے کا حق نہیں ہے جس کی بدبو ان دیواروں کو توڑ کر باہر آتی ہو جس کو ایک مرتبہ پڑھنے کے بعد انسان کئی کئی ہفتے ذہنی انتشار میں مبتلا رہے، اور ان خیالات، مقاصد اور ان تعلیمات سے اس کو کوئی اتفاق باقی نہ رہے، جو اس درسگاہ کے بنیادی مقاصد میں داخل ہیں، اس کے لئے آپ کے دل اور ضمیر کا احتساب کافی ہے۔

طالبانِ علومِ نبوّت کا مقام

اور

ان کی ذمہ داریاں

یہ مضمون مارچ ۱۹۵۴ء میں دارالعلوم دیوبند میں طلبہ کے ایک جلسہ میں پڑھا گیا تھا اور بعد میں رسالہ کی شکل میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں دینی مدرسہ کا حقیقی منصب و مقام اور اس کے طلبہ و فضلاء کے فرائض و ذمہ داریاں بتلائی گئی ہیں، اور ان کو آگاہ کیا گیا ہے کہ عصرِ جدید ان سے کس قسم کی توقعات رکھتا ہے، اور اس دور میں دین کی دعوت اور خدمت کے لئے ان کو کس قسم کی تیاریوں کی ضرورت ہے، اپنے مضامین کی اہمیت اور افادیت کے پیشِ نظر اس کو بھی اس مجموعہ میں شامل کیا جاتا ہے۔

طالبانِ علومِ نبوت کا مقام
اور
ان کی ذمہ داریاں

رب اشرح لی صدری ویسر لی امری واحلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی۔

عزیزانِ گرامی!

مجھے اس وقت آپ سے اس حیثیت سے گفتگو کرنی ہے کہ آپ دینی مدرسہ کے طالب علم ہیں، اور میں ان کا دیرینہ خادم اور آپ کا رفیق سفر، موضوع کی اہمیت اور وقت کی نزاکت کا تقاضا ہے، کہ میں آپ کے سامنے اپنی زندگی کے تجربات اور اپنے محدود مطالعہ کے نتائج بے تکلف رکھ دوں، اور زندگی کے سفر کی سب سے قیمتی اور عزیز سوغات آپ کے سامنے پیش کر دوں، آپ نے مجھے گفتگو کا موقع دے کر عزت بخشی ہے، آپ نے مجھ پر اعتماد کا اظہار کیا ہے، میری خواہش اور کوشش ہونی چاہئے کہ میں اس اعتماد کا اہل ثابت ہوں، اور اس تھوڑے سے وقت سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤں، اس لئے کہ یہ وقت آپ نے بڑے قیمتی مشاغل میں سے نکالا ہے، اور یہ ان لوگوں کا وقت ہے جن کی ساعتیں اور لمحات مہینوں اور برسوں کے حساب سے تلنے چاہئیں۔

مدرسہ کیا ہے؟

دوستو! ہم کو سب سے پہلے معلوم ہونا چاہئے کہ ایک دینی مدرسہ کا مقام اور منصب کیا ہے؟

مدرسہ کیا ہے؟ مدرسہ سب سے بڑی کارگاہ ہے، جہاں آدم گری اور مردم سازی کا کام ہوتا ہے، جہاں دین کے داعی اور اسلام کے سپاہی تیار ہوتے ہیں، مدرسہ عالم اسلام کا بجلی گھر (پاور ہاؤس) ہے، جہاں سے اسلامی آبادی بلکہ انسانی آبادی میں بجلی تقسیم ہوتی ہے، مدرسہ وہ کارخانہ ہے، جہاں قلب و نگاہ اور ذہن و دماغ ڈھلتے ہیں، مدرسہ وہ مقام ہے، جہاں سے پوری کائنات کا احتساب ہوتا ہے، اور پوری انسانی زندگی کی نگرانی کی جاتی ہے، جہاں کا فرمان پورے عالم پر نافذ ہے، عالم کا فرمان اس پر نافذ نہیں، مدرسہ کا تعلق کسی تقویم، کسی تمدن، کسی عہد، کسی کلچر، زبان و ادب سے نہیں کہ اس کی قدامت کا شبہ اور اس کے زوال کا خطرہ ہو، اس کا تعلق براہ راست نبوت محمدی سے ہے، جو عالمگیر بھی ہے، اور زندۂ جاوید بھی، اس کا تعلق اس انسانیت سے ہے جو ہر دم جواں ہے، اس زندگی سے ہے جو ہمہ وقت رواں اور دواں ہے، مدرسہ درحقیقت قدیم و جدید کی بحثوں سے بالاتر ہے، وہ تو ایسی جگہ ہے، جہاں نبوت محمدی کی ابدیت اور زندگی کا نمو اور حرکت دونوں پائے جاتے ہیں۔

مدرسہ کی ذمہ داری و گراں باری

حضرات! کسی مدرسہ کے لئے اس سے بڑھ کر قابل احتجاج اور قابل اعتراض لفظ نہیں ہوسکتے کہ وہ محض ایک دار الآثار یا کسی قدیم عہد کی یادگار ہے، میں اس کو مدرسہ کے حق میں ازالۂ حیثیت عرفی کے مرادف سمجھتا ہوں، میں مدرسہ کو ہر مرکز سے بڑھ کر مستحکم، طاقت ور، زندگی کی صلاحیت رکھنے والا، اور حرکت و نمو سے لبریز سمجھتا ہوں، اس کا ایک سرا نبوت محمدی سے ملا ہوا ہے، دوسرا سرا اس زندگی سے، وہ نبوت محمدی کے چشمۂ حیواں سے پانی لیتا ہے، اور زندگی کے ان کشت زاروں میں ڈالتا ہے، وہ اپنا کام چھوڑ دے تو زندگی کے کھیت سوکھ

جائیں اور انسانیت مرجھانے لگے، نہ نبوتِ محمدی کا دریا پایاب ہونے والا ہے، نہ انسانیت کی پیاس بجھنے والی ہے، نہ نبوت محمدی کے چشمۂ فیض سے بخل اور انکار ہے، نہ انسانیت کے کاسۂ گدائی کی طرف سے استغناء کا اظہار، ادھر سے "انما انا قاسم واللہ یعطی" کی صدائے مکرر ہے، تو ادھر سے "ھل من مزید، ھل من مزید" کی فغانِ مسلسل، مدرسہ سے بڑھ کر دنیا میں کون سا زندہ متحرک اور مصروف ادارہ ہو سکتا ہے، زندگی کے مسائل بے شمار، زندگی کے تغیرات بے شمار زندگی کی ضرورتیں بے شمار، زندگی کی غلطیاں بے شمار، زندگی کی لغزشیں بے شمار، زندگی کے فریب بے شمار، زندگی کے رہزن بے شمار، زندگی کی تمنائیں بے شمار، زندگی کے حوصلے بے شمار، مدرسہ نے جب زندگی کی رہنمائی اور دستگیری کا ذمہ لیا تو اسے اب فرصت کہاں؟ دنیا میں ہر ادارہ، ہر مرکز، ہر فرد کو راحت اور فراغت کا حق ہے، اس کو اپنے کام سے چھٹی مل سکتی ہے، مگر مدرسہ کو چھٹی نہیں، دنیا میں ہر مسافر کے لئے آرام ہے، لیکن اس مسافر کے لئے راحت حرام ہے! اگر زندگی میں ٹھہراؤ ہو، سکون اور وقوف ہو، تو حرج نہیں کہ مدرسہ بھی چلتے چلتے دم لے لے، لیکن جب زندگی رواں اور دواں ہے، تو مدرسہ میں جمود اور تعطل کی گنجائش کہاں ہے، اس کو قدم قدم پر زندگی کا جائزہ لینا ہے، بدلتے ہوئے حالات میں احکام دینے ہیں، نئے نئے فتنوں کا مقابلہ کرنا ہے، بھٹکے ہوئے قدموں کو راستے پر لگانا ہے، ڈگمگاتے ہوئے پیروں کو جمانا ہے، وہ زندگی سے پیچھے رہ جائے یا تھک کر بیٹھ جائے، یا کسی منزل پر قیام کرلے، یا اس کو کوئی مقام خوش آجائے، تو زندگی کی رفاقت اور قیادت کون کرے، سرود ازلی اور پیغام محمدی اسے کون سنائے، مدرسہ کا تعطل، قیادت سے کنارہ کشی، کسی منزل پر قیام، خودکشی کا مرادف اور انسانیت کے ساتھ بے وفائی کا ہم معنی ہے، اور کوئی خود شناس، اور فرض آشنا مدرسہ اس کا تصور نہیں کرسکتا۔

طلبہ و فضلائے مدارس کی ذمہ داریاں

دوستو! مدرسہ کے طالب علم کی حیثیت سے آپ کا کام سب سے زیادہ نازک اور سب سے زیادہ عظیم ہے، میں نہیں جانتا کہ اس وقت دنیا کی کسی جماعت یا کسی گروہ کا کام اتنا نازک، وسیع اور اہم ہو، ان الفاظ پر دوبارہ غور کیجئے کہ آپ کا ایک سرا نبوت محمدی سے ملا ہوا ہے، دوسرا سرا زندگی سے، یہی آپ کے کام کی نزاکت کی وجہ اور آپ کی عظمت کی دلیل ہے، نبوتِ محمدی سے وابستگی اور اتصال جہاں ایک بہت بڑی خوش نصیبی اور سرفرازی ہے، وہاں ایک عظیم ذمہ داری بھی ہے، آپ کے پاس حقائق اور عقائد کی سب سے بڑی دولت اور سب سے عظیم سرمایہ ہے، اس وابستگی سے آپ پر چند ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، آپ میں غیر متزلزل یقین اور راسخ ایمان ہونا چاہیے، آپ میں یہ حوصلہ اور ہمت ہونی چاہیے کہ ساری دنیا ملتی ہو، تو اس کے ایک نقطہ سے بھی دستبردار ہونے کے سوال پر غور نہ کرسکیں، آپ کے دلوں میں اس کی حمایت ونصرت کا جذبہ موجزن ہونا چاہیے، آپ کا دل اس بے بدل دولت پر فخر اور شکر سے لبریز ہو، آپ کو اس کی صداقت، اس کی معقولیت، اس کی ابدیت، اس کی ہر زمانہ میں صلاحیت، اس کی بلندی و برتری، اور اس کی معصومیت پر غیر متبدل یقین ہو، آپ اس کے مقابل ہر چیز کو پورے اطمینان کے ساتھ جاہلیت، اور جاہلیت کی میراث سمجھتے ہوں، آپ جہاں احکامِ خداوندی اور تعلیمات اسلامی کو سن کر "سمعنا واطعنا" کہیں، وہاں جاہلیت کے نظام اور جاہلیت کے علمبرداروں کو مخاطب کرکے کہیں کہ کَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ" آپ اسلام ہی کی رہنمائی اور اسوۂ محمدی ہی کی روشنی میں دنیا کی نجات کا یقین رکھتے ہوں، اور آپ کا اس پر عقیدہ ہو کہ اس طوفانِ نوح میں سفینۂ

نوع صرف محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور امامت ہے' آپ یقین کرتے ہوں کہ افراد اور اقوام کی سرفرازی اور سربلندی کی شرط صرف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے' اور یہ بالکل حقیقت ہے کہ ؎

محمدؐ عربی کہ آبروئے ہر دو سرا است
کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سر او

آپ تعلیماتِ نبوت کو علم کا لب لباب اور حقیقۃ الحقائق سمجھتے ہوں' آپ اس کے مقابلے میں تمام دنیا کی الٰہیات اور فلسفۂ مابعد الطبعیات اور قیاسات و روایات کو افسانہ و خرافات سے زیادہ وقعت دینے کے لئے تیار نہ ہوں، آپ توحید کی حقیقت سے واقف اور اس پر مصر ہوں' اور شرک اور تمام دنیا کے علم الاصنام کو خواہ وہ کیسے ہی پُرجلال علمی اصطلاحات اور فلسفہ کی زبان میں بیان کیا گیا ہو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوں' اور "زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا" سے زیادہ مرتبہ دینے کے لئے آمادہ نہ ہوں آپ سنت کے اتباع کے حریص' اور "خَیْرُ الْھَدْیِ ھَدْیُ محمد صلے اللہ علیہ وسلم" پر یقین رکھتے ہوں' اور بدعات کے مضر اور نامقبول ہونے پر آپ کو شرح صدر ہو' غرض آپ اعتقادی، ذہنی، فکری، قلبی' ذوقی اور عملی حیثیت سے نبوتِ محمدی کی جامعیت اور عملیت کے قائل اور اس کی عملی تفسیر ہوں۔

طلباء و فضلاء کا امتیاز

دوستو! دنیا کے دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ میں آپ کا امتیاز یہ ہے کہ ان حقائق پر دوسروں کا اجمالی ایمان کافی ہے مگر آپ کو اس پر پورا ذہنی اطمینان اور شرح صدر ہونا چاہئے، آپ کا صرف قائل ہونا کافی نہیں' اس کا داعی ہونا ضروری ہے' دوسروں کا یقین لازمی ہو تو کافی،

ہے، آپ کا یقین متعدی ہونا چاہیئے، جو سیکڑوں ہزاروں انسانوں کو یقین سے لبریز کردے، اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک کہ آپ کا یہ سرور سرخوشی و سرمستی اور بے خودی کی حد تک نہ پہونچا ہو، اور آپ میں "یکرہ ان یعود الی الکفر کما یکرہ ان یقذف فی النار" کی حقیقت نہ پائی جاتی ہو، تعلیمات نبوت سے دوسروں کی سرسری واقفیت کافی ہے، مگر آپ کے لئے علومِ نبوت میں رسوخ، علومِ نبوت سے عشق، علومِ نبوت میں مقام فنائیت، علومِ نبوت پر اصرار ضروری ہے، اس کے بغیر دعوت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، بلکہ دعوتوں اور تحریکوں کے اس طوفانی دور میں اس کے بغیر اپنی خصوصیات اور سرمایہ کی حفاظت بھی مشکل ہے۔

کیفیاتِ باطنی

یہ بھی یاد رکھئے کہ نبوتِ محمدی نے جس طرح علوم واحکام کا ایک بے پایاں دفتر اور وسیع ترین ذخیرہ چھوڑا "فان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درھما ولکن ورثوا ھذا العلم" یہ ذخیرہ قرآن وحدیث، فقہ واحکام کی صورت میں محفوظ ہے، اور آپ کا مدرسہ بحمداللہ اس کی خدمت واشاعت کا بہت بڑا مرکز ہے، اسی طرح نبوتِ محمدی نے کچھ اوصاف، خصوصیات اور کیفیات بھی چھوڑے، جس طرح پہلا سرمایہ نسل در نسل منتقل ہوتا رہا، اور اللہ تعالےٰ نے اس کی حفاظت واشاعت کا انتظام کیا، اسی طرح دوسرا سرمایہ بھی برابر منتقل ہوتا رہا ہے، اور اللہ تعالےٰ نے اس کی حفاظت کا بھی انتظام فرمایا ہے، یہ اوصاف وخصوصیات کیا ہیں؟ یقین واخلاص، ایمان واحتساب، تعلق مع اللہ، انابت واخبات، خشوع وخضوع، دعاو ابتہال، استغنا، وتوکل، اعتماد علی اللہ، درد ومحبت، خود شکنی وخودداری، علوم نبوت و احکام اور اوصاف وکیفیات دونوں کی جامع تھی، "ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا

"مِنْهُمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ" نبوت محمدی سے صرف علوم واحکام لینا اور کیفیات واوصاف کو ترک کردینا ناقص وراثت ہے، اور ناکمل نیابت۔ دنیا میں جن لوگوں نے نبوت کی نیابت کی اور اسلام کی امانت ہم تک پہونچائی، وہ صرف ایک حصہ کے امین نہ تھے، وہ دونوں دولتوں سے مالامال تھے، اب بھی اسلام کی دعوت، اور اسلامی انقلاب صرف پہلے حصہ سے برپا نہیں کیا جاسکتا، آپ کو جن اسلاف کی طرف نسبت کا شرف حاصل ہے، وہ بھی ان دونوں خصوصیتوں کے جامع تھے، آپ اگر حقیقی نیابت کے منصب بلند پر سرفراز ہونا چاہتے ہیں تو آپ کو اس جامعیت کی کوشش کرنی پڑے گی، اس کے بغیر علم وفن کی صناعی کاغذی پھول ہیں، جن میں نہ خوشبو، نہ تازگی، آج دنیا کے بازار میں کاغذی اور ولایتی پھولوں کی کمی نہیں، ہم اور آپ اس میں کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہیں کرسکتے، یہاں تو نبوت کے باغ کے شاداب پھول چاہئیں، جو مشامِ جاں کو معطر کردیں، اور جن کے سامنے دنیا کے پھول شرما جائیں: "فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ"۔

مدارس کا باطنی انحطاط

آپ بُرا نہ مانیں، کہنے والا بھی آپ ہی میں سے ہے، عرصہ سے ہمارے مدارس ان شاداب پھولوں سے خالی ہوتے جارہے ہیں، ان اوصاف میں روزافزوں انحطاط ہے، ہم کو دل پر پتھر رکھ کر سننا چاہیے، اور دیکھنا چاہیے کہ کہنے والے نے کہاں تک صحیح کہا ہے کہ ؎

اٹھا میں مدرسہ وخانقاہ سے نمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے مدارس سے جس تعداد میں لوگ فارغ ہوکر نکلتے ہیں،

کبھی اس تعداد میں نہیں نکلتے تھے، لیکن زندگی پر کوئی اثر نہیں ڈال رہے ہیں۔

انقلاب انگیز شخصیتیں

پہلے اسی ملک میں خواجہ معین الدین اجمیریؒ یا سید علی ہمدانی کشمیریؒ جیسا ایک فقیر بے نوا آتا اور پورے کے پورے ملک کو اپنے قلب کی حرارت اور اپنے ایمان کے نور سے بھر دیتا، حضرت مجدّد الف ثانی نے حکومت مغلیہ میں انقلاب برپا کردیا، انھیں کی خاموش مساعی کا نتیجہ تھا کہ ہم اکبر کے تخت پر اورنگ زیب جیسے فقیہ و متشرع بادشاہ کو دیکھتے ہیں، شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس طویل و عریض ملک کا رجحان بدل دیا، اور پورے نظام فکر اور نظام تعلیم پر گہرا اثر ڈالا، مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے ایک عام مایوسی اور پسپائی کے دور میں تنہا بڑا اسلامی قلعہ تعمیر کردیا، اور علوم شریعت کو ایک نئی زندگی بخشدی، ابھی پچھلے عرصہ میں مولانا محمد الیاسؒ نے ایمان اور دینی جدّ و جہد کی ایک نئی روح پھونک دی۔

غرض۔ ع

جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے

آج ہمارے فضلا، اس روح سے خالی، ان کیفیات سے عاری اور اس قوت سے محروم ہیں، جو لوگوں کو نئے سرے سے سوچنے اور بدل جانے پر مجبور کردیتی تھی، زمانہ بڑا حقیقت شناس ہے، وہ صرف بلندی کے سامنے جھکتا ہے، دماغ، بلند دماغ کے سامنے جھکتے ہیں، اور خالی اور سرد دل معمور اور گرم دل کا لوہا مانتے ہیں، ہمارے مدارس میں دماغی انحطاط بھی روز افزوں ہے اور قلبی افسردگی بھی رو بہ ترقی، مقررین اور واعظین کی اب بھی کمی نہیں، مگر بقول حضرت جگر۔ ع

آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں چہرہ پہ یقیں کا نور نہیں

مدارس کی افسردہ فضا

مدارس جو کبھی طاقت اور زندگی کا مرکز تھے، اور جہاں انقلاب آفریں شخصیتیں پیدا

ہوتی تھیں، وہ مایوسی، افسردگی، اور احساس کہتری کا شکار ہیں، آج مدارس کی تعداد میں، ان کے طلبہ کی تعداد میں درس کی کتابوں کی تعداد میں کتبخانے کے مندرجات کی تعداد میں وظائف کی تعداد میں بہت بڑا اضافہ ہے، مگر زندگی کی نبض سست اور قلب کی دھڑکن کمزور ہے، کوئی حساس دردمند کبھی کبھی اس طرف نکل جاتا ہے تو اس کا دم گھٹنے لگتا ہے، اور وہ اس بحر کاہل کو دیکھ کر کہنے لگتا ہے ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے ۔۔۔ کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ، کہ تو ۔۔۔ کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

لیکن اب تو مدارس کے حق میں کسی طوفان سے آشنا ہونے کی دعا کرتے ہوئے بھی دل ڈرتا ہے، آج مدارس میں طوفان کے آثار نظر آتے ہیں، لیکن یہ باہر کے طوفان کے تھپیڑے اور موجیں ہیں، جو مدارس کے در و دیوار سے ٹکرا رہی ہیں، یہ باہر کے ہنگاموں اور سطحی اور عوامی تحریکات کی صدائے بازگشت ہے، جس میں ہمارے مدارس کے طلبہ کا مقام محض نقال یا آلۂ صوت کا ہے۔

دنیا کا امام، تقلید و پیروی کے مقام پر

یہ بڑا افسوس ناک منظر، اور بڑی دل خراش حقیقت ہے کہ جو تحریکیں اور دعوتیں، جو ہنگامے اور شور، جو انتشار و اضطراب، جو تنظیمیں اور طریقۂ احتجاج آج عصری درسگاہوں اور دنیاوی تعلیم گاہوں میں نامقبول ہو رہے ہیں، اور پیش پا افتادہ اور کہنہ و فرسودہ سمجھے جانے لگے ہیں، وہ ہمارے مدارس میں اب بار یاب ہو رہے ہیں، اور جن کو زمانہ کا محتسب، اپنے عصر کا امام، اور خود صاحب دعوت اور صاحب مقام ہونا چاہئے تھا، وہ لادینی درسگاہوں کا متبع اور مقلّد ہونے پر فخر کر رہے ہیں ؎

کر سکتے تھے جو اپنے زمانہ کی امامت ۔۔۔ وہ کہنہ دماغ اپنے زمانہ کے ہیں پیرو

آج مدارس کا سب سے بڑا فتنہ اور سب سے بڑا ذہنی طاعون بڑھتا ہوا احساس کہتری ہے، جو گھن کی طرح اس درخت کو کھاتا چلا جا رہا ہے، کسی ادارہ کو اگر یہ گھن لگ جائے تو پھر اس کی زندگی محال ہے۔

احساسِ کہتری کیوں؟

عزیزو! آپ احساسِ کہتری کا کیوں شکار ہوں؟ دوسروں کا احساسِ کہتری ایک نفسیاتی مرض ہے، مگر آپ کا احساسِ کہتری دینی کمزوری، ضعفِ عقیدہ، اور ضعفِ ایمان کی دلیل ہے، جس کے نتائج بہت سنجیدہ اور دور رس ہیں، انبیاء کے نائبین اور علومِ نبوت کے حاملین کو اپنی کہتری اور حقارت کا احساس ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ نبوت کے مقام سے ناآشنا اور یقین سے خالی ہیں، آپ تو ان ہستیوں کے جانشین ہیں، جن کے متعلق عارف رومی نے بجا طور پر کہا تھا ؂

نخوتے دارند و کبرے چوں شہاں
چاکری خواہند از اہلِ جہاں

اور جن کے متعلق سعدیؒ کے الفاظ میں یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ۔ ع

شہان بے کلہ و خسروانِ بے کمراند

خودشناسی و خودداری

آپ کے پاس جو دولت ہے، اس سے دنیا کا دامن خالی ہے، آپ کے سینہ میں علومِ نبوت ہیں، اور وہ حقائق ہیں جو دنیا سے گم ہو چکے ہیں، اور جن کے گم ہونے سے آج عالم

میں اندھیرا ہے، اضطراب و انتشار ہے، شر و فساد ہے، آپ اپنے ان سادہ کپڑوں، ان حقیر جسموں اور اس خالی جیب و دامن پر نظر نہ کریں، آپ دیکھیں کہ آپ کا سینہ کن دولتوں سے معمور اور آپ کے اندر کیسا بدرِ کامل مستور ہے ؎

بر خود نظر کشا ز تہی دامنی مرنج

در سینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند

آپ یاد رکھیں، حقارت و ذلت کا تعلق انسان کے اندرون سے ہے، عالم خارجی اور بیرونی دنیا سے بہت کم ہے، حقارت ایک نفسیاتی کیفیت کا نام ہے، احساسِ حقارت نتیجہ ہے انسان کے شک و شبہ، ضعف و تذبذب، اور خود شناسی کے فقدان کا، انسان خود اپنے کو حقیر و بے مایہ سمجھتا ہے، اور اس کو دھوکہ ہوتا ہے کہ لوگ اس کو حقیر سمجھتے ہیں، اور دنیا میں وہ بے قیمت اور ذلیل ہے، حالانکہ یہ جفا وہ خود اپنے اوپر کرتا ہے، یاد رکھئے جو خود اپنی نگاہ میں ذلیل ہو جائے اس کو کوئی باعزت نہیں بنا سکتا، اور جو خود اپنے کو اپنی نظر سے گرا دے، کسی کو اس کی بالکل ضرورت نہیں کہ اس کو اپنے دل یا آنکھوں میں جگہ دے جس کی گنجائش خود اپنے یہاں نہیں ہے، اس کی گنجائش کون و مکان میں نہیں ہے، یہ زمین بقدرِ دل سمٹتی اور پھیلتی ہے، اور اس کی وسعت گھٹتی اور بڑھتی ہے، آدمی کو یہ دیکھنا چاہئے کہ اس نے اپنے کو اپنے دل میں کیا مقام دیا ہے، اور اس کا معاملہ خود اپنی ذات کے ساتھ کیا ہے، اگر کسی نے اپنے کو ذلیل و حقیر، مجبور و بے بس، تہی دست و بے بضاعت، اور دنیا کے بازار میں بے قیمت و بے ضرورت سمجھ لیا ہے، تو اس کو دنیا سے کسی انصاف اور کسی اعزاز کی توقع نہیں کرنی چاہئے، حاتم طائی نے اسی حقیقت کو اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

وتفسك اكرمها فانك ان تهن

عليك فلن تلقىٰ من الناس مكرما

"اپنی ذات کی خود عزت کرو، اس لئے کہ اگر تم اپنی نگاہ میں ذلیل اور بے وزن ہو جاؤ گے تو پھر دنیا میں تمھیں کوئی بھی عزت کرنے والا نہیں ملے گا۔"

دوستو! مجھے یقین ہے کہ ہم حقیر نہیں ہیں، صرف احساس حقارت کے مریض ہیں، اور یہ احساس حقارت ہماری خود ناشناسی اور خود فراموشی پر مبنی ہے، اس کا علاج صرف یہ ہے کہ ہم اپنے مقام سے باخبر ہو جائیں اور اپنی دولت اور سرمایہ کا صحیح جائزہ لیں، دنیا کی تبدیلی، نگاہوں کی تبدیلی، سب ہماری نگاہ کی تبدیلی کی تابع ہے، جس دن ہماری یہ نگاہ بدلی، دنیا بدل جائے گی، اور حقارت کا یہ مہیب سایہ جو ہمارے دل و دماغ پر مسلط ہے، اور ہم کو ڈرا رہا ہے، کافور ہو جائے گا، کہنے والے نے کچھ غلط نہیں کہا ؎

اور اگر باخبر اپنی شرافت سے ہو
تیری سپہ انس و جن، تو ہے امیر جنود

ہماری قدیم اور معاصر تاریخ میں جن اشخاص نے اپنے مقام کو پہچان لیا، اور جن کو اس کا احساس ہو گیا کہ اللہ نے ان کو کون سی دولت دی ہے، اور کس منصب پر سرفراز کیا ہے، ان کو یہ سارا عالم پست نظر آنے لگا، ان کو سلطنتیں نہیں خرید سکیں، انھوں نے دنیا کی بڑی سے بڑی پیش کش سن کر ہمیشہ زیر لب مسکرا کر کہا ؎

برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

انسانی تاریخ کی آبرو جو ارزاں فروشیوں اور خود فراموشیوں کی داستانوں سے داغدار ہے، انھیں خود آشنا و خدا شناس انسانوں کے دم سے ہے، انسانیت کا سر انھیں کی بدولت اونچا ہے، جنھوں نے اپنا سر ہمیشہ اونچا رکھا۔

زندگی کی آبرو خودداروں کے دم سے قائم ہے

عزیزانِ گرامی! اس زندگی کے بقاء وتسلسل کے لئے جس طرح غذا اور لباس کی ضرورت ہے، مادّی سازوسامان کی ضرورت ہے، اور لوگوں نے اس کا ذمہ لیا ہے، اسی طرح زندگی کے فروغ اور وقار اور انسانیت کے شرف اور اعتبار کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس مادہ پرست کوتاہ بیں دنیا میں وقتاً فوقتاً پیغمبرانہ خودداری اور دنیا کے پیمانوں کے انکار اور حقارت کا بھی اظہار ہوتا رہے، اور کسی کسی گوشہ سے یہ صدا بھی آتی رہے کہ "اَتُمِدُّوْنَنِیْ بِمَالٍ فَمَا اٰتَانِیَ اللّٰہُ خَیْرٌ مِّمَّا اٰتَاکُمْ بَلْ اَنْتُمْ بِھَدِیَّتِکُمْ تَفْرَحُوْنَ" جس روز یہ صدا بالکل بند ہو جائے گی، اور ساری دنیا نیلام کی منڈی بن جائے گی، جہاں جوہر ادراک، شعلۂ ایمان، اور متاعِ علم سب کسی نہ کسی دام پر ملنے لگیں گے، اور انسان جمادات اور حیوانات کی طرح ارزاں اور گراں بکنے لگیں گے، اس دن یہ دنیا رہنے کے قابل نہ رہے گی۔ اور انسانیت اپنی آب وتاب کھودے گی، اب اس کی ذمہ داری کہ انسانیت کی خودداری اور پیغمبروں کی سرداری کی شان قائم رہے، تنہا آپ کے سر ہے، اس کی توقع ان درسگاہوں سے نہیں کی جاسکتی، جنھوں نے معدہ اور پیٹ کے نصب العین سے بلند ہونے کا دعویٰ خود بھی نہیں کیا، اس کی توقع تو آپ ہی سے ہوسکتی ہے، جن کے اسلاف میں امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ جیسے غیور اور خودشناس امام گذرے ہیں، جن کو حکومتِ عباسیہ کسی قیمت پر خرید نہ سکی، امام غزالیؒ جیسے عالی ہمت جنھوں نے حریم خلافت کے اشارہ کے باوجود نظامیہ بغداد کی صدر مدرسی جو خلافت کے بعد سب سے بڑا دینی اعزاز تھا قبول نہیں کی، حضرت مجدد الف ثانیؒ جیسے صاحبِ عزیمت جنھوں نے جہانگیر کے سامنے جھکنے پر گوالیار کی اسیری کو ترجیح دی آپ کے اسلاف میں حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں بھی ہیں، جن کو بادشاہ دہلی نے پیغام بھیجا کہ

اللہ نے اتنی بڑی سلطنت مجھے عطا کی ہے، آپ اس میں سے کچھ قبول فرمالیں، فرمایا اللہ تعالےٰ تو ہفت اقلیم کو "متاع الدنیا قلیل" فرماتا ہے، پھر ایک اقلیم میں سے ایک ولایت آپ کے حصے میں آئی ہے، وہ کتنی ہے کہ فقیر اس کی طرف طمع کا ہاتھ بڑھائے، نواب آصف جاہ نے ایک بار بیس ہزار روپیہ نذر کیا، آپ نے قبول نہیں فرمایا، نواب نے کہا لے کر محتاجوں کو بانٹ دیجئے، فرمایا کہ مجھ کو اس کا سلیقہ نہیں، یہاں سے نکل کر بانٹتے چلے جایئے، گھر تک پہونچتے پہونچتے تقسیم ہو جائے گا، نہ ہو تو وہاں ہو جائے گا، آپ کے اسلاف میں سے حضرت شاہ غلام علی صاحب دہلوی بھی تھے، نواب میر خاں والیِ ریاست ٹونک نے ان کی خانقاہ کے سالانہ مصارف کے لئے کچھ مقرر کرنا چاہا تو ان کو لکھ دیا گیا کہ ؎

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم
با میر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

آپ کے اسلاف میں مولانا عبد الرحیم رامپوری جیسے مدرس گذرے ہیں، جنھوں نے ریاست کے دس روپیہ ماہوار کو بریلی کالج کی ڈھائی سو روپیہ کی اسامی پر اور لوجہ اللہ پڑھانے کو ایک معزز پروفیسری پر یہ کہہ کر ترجیح دی کہ اگر خدا نے قیامت کے دن پوچھا تو میں کیا جواب دوں گا، آپ کے اسلافِ کرام میں دار العلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی ذات گرامی ہے، جنھوں نے علی گڑھ کے ایک دیندار رئیس کی تنخواہ میں جو غالباً دس روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ تھی، دو روپیہ ماہوار یہ کہہ کر کمی کرادی کہ میں دو روپیہ اپنی والدہ صاحبہ کو دیا کرتا تھا، ان کے انتقال کے بعد یہ روپیہ فاضل ہے، اور میں قیامت کے دن اس کے حساب سے بچنا چاہتا ہوں، آپ کے اسلافِ قریب میں وہ ایثار پیشہ مدرسین ہیں، جنھوں نے اپنے مدارس کی چھوٹی چھوٹی تنخواہوں اور اپنے اساتذہ اور شیوخ کے قرب پر بڑی بڑی درسگاہوں کی بڑی بڑی پیشکشوں کو قربان کر دیا، اور

عسرت اور تنگی میں اپنی عمر بسر کر دی، آپ کو یقیناً یہ شعر پڑھنے کا حق ہے کہ ؎

اولئك آبائی فجئنی بمثلھم　　　اذا جمعتنا یا جریر المجامع

یہ راستہ معاشی حوصلہ مندیوں کا نہیں

دوستو! آپ اس سے یہ خیال نہ فرمائیں کہ مجھے زمانہ کی تبدیلی، ضروریات کی زیادتی، ہمتوں اور قویٰ کی کمزوری، حالات کے اختلاف کا کوئی احساس نہیں، اور میں آپ سے اس زمانہ میں مولانا عبدالرحیم اور مولانا محمد قاسم صاحب کے ایثار و زہد کا پورا پورا مطالبہ کر رہا ہوں، لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ آپ کا راستہ بلاشبہ ایثار و قناعت، جد و جہد، جفاکشی اور بلند ہمتی کا ہے، آپ نے جو راستہ انتخاب کیا ہے، یا مرضیِ الٰہی نے آپ کے لئے پسند کیا ہے، وہ معاشی حوصلہ مندیوں اور دنیاوی سربلندیوں کا راستہ نہیں، اس راستے پر تو "قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَا" کا طعنہ سننا ہی پڑے گا، اس راستے پر تو "وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى" کا سبق پڑھنا ہی پڑے گا، لیکن اس کا انعام کیا ہے، وہ بھی سن لیجیے "وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ" مولانا روم نے اسی مقام کی خبر دی ہے کہ ؎

معدہ را بگزار سوئے دل خرام
تا کہ بے پردہ ز حق آید سلام

زمانہ کی بے بضاعتی و تشنہ لبی

آپ کو جو احساس کہتری تکلیف دے رہا ہے، اس کی کچھ تو وجہ یہ ہے کہ آپ اپنے

مقام سے واقف نہیں، میں نے اس کو تفصیل سے عرض کر دیا ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ اس دنیا سے واقف نہیں، آپ کو معلوم نہیں کہ زمانہ کس قدر بے بضاعت و تہی دامن اور کس قدر تشنہ لب ہے، آپ اس زمانہ کو مرعوب اور للچائی ہوئی نظر سے دیکھتے ہیں، اس لئے کہ آپ اس سے ناآشنا ہیں، آپ اس کو قریب سے دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ کس درجہ دیوالیہ ہے، اور اس کو اپنے دیوالیہ پن کا شدت سے احساس ہو رہا ہے، اس کے سب سکّے کھوٹے نکلے، اس کے سب تیر دغا دے گئے، اس کے سب چشمے سراب ثابت ہوئے، اس کے سب فلسفے اور نظام اس کے سب اِزم ناکام رہے، اس کے سب خواب بے تعبیر رہے، آپ کے پاس نبوتِ محمدی کے عطا کئے ہوئے جو حقائق ہیں، ان کو اپنی کم نظری سے پیش کرتے ہوئے آپ شرماتے ہیں کہ یہ زمانہ سائنس اور سیاسیات اور اقتصادیات کی ترقی کا ہے، لیکن دنیا کا حال یہ ہے کہ آج وہ انھیں کے لئے بیتاب اور چشم براہ ہے، آج قومیں ان لوگوں کے انتظار میں ہیں، جو ان کو زندگی کا نیا راستہ بتلائیں، اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا پیغام حیات سنائیں ؎

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف
بامید آں کہ روزے بشکار خواہی آمد

اصل متاعِ علوم انبیاء

آپ جن باتوں کو معمولی سمجھتے ہیں، اور جن کو آپ نے کوئی وقعت نہیں دی، میں نے بڑے بڑے فاضلوں کو ان پر سر دھنتے دیکھا ہے جب کبھی ان کے سامنے پیغمبروں کی بتلائی ہوئی باتیں کی گئیں تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی بلندی سے خطاب کیا جا رہا ہے، اور ان کے کان اس سے ناآشنا تھے، آپ دنیا کے بازار میں اسی کا مال اور اسی کے مصنوعات لے جانا چاہتے ہیں، پھر اس کا

کیا شکوہ کہ وہ "بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَیْنَا" کہہ کر آپ کے سامنے ڈال دیتی ہے، دنیا آپ سے امیدوار ہے کہ آپ انبیاء علیہم السلام کی لائی ہوئی اطلاعات اور بتلائے ہوئے راستہ کو پیش کریں، دنیا آج بھی ان کے سامنے سر جھکانے کے لئے تیار ہے، اس کے دماغ اب بھی اس کے سامنے سرنگوں ہیں، جیسے چھٹی صدی مسیحی کے محدود ماحول میں سرنگوں تھے، یقیناً آپ کے پاس یونانیوں کے طبعیات وعنصریات و فلکیات پر جو چند اوراق ہیں، اس کے مقابلے میں یورپ کے پاس سائنس اور تجربات ومشاہدات کی ایک دنیا ہے، یہ بھی واقعہ ہے کہ آپ آج یورپ کو یونان کی فلسفیانہ موشگافیوں اور عقلیات کی دقیقہ سنجیوں سے مرعوب نہیں کر سکتے، ان کی زندگی ختم ہو گئی ہے، اور وہ اپنی طاقت کھو چکے ہیں، لیکن آپ کے پاس انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے جو علوم اور حقائق ہیں، یورپ و ایشیا ان سے اب بھی محروم ہے، اس کے پاس آپ کے عقلی و فکری نتائج اور آپ کے علمی ذخیرے کا کچھ نہ کچھ جواب ہے، لیکن انبیاء علیہم السلام کے معجزات کا جواب نہیں، آپ اپنی اصل قوت اور حقیقی دولت لے جائیں اور پورے اعتماد ویقین کے ساتھ زندگی کے میدان میں آئیں، اس میدان میں آپ کا کوئی حریف نہیں، آپ کے پاس انسانیت کے لئے جو دعوت اور پیغام ہے، آپ کے پاس علم وحقیقت کا جو سرچشمہ ہے، آپ کو جس ذاتِ گرامی سے نسبتِ غلامی حاصل ہے، اس کے بعد آپ میں سے ہر شخص کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ ؎

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ بر فتراکِ صاحب دولتے بستم سر خود را

وہ دانائے سُبل ختم الرسل مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

علومِ اسلامیہ کا زندگی سے ربط و تعلق اور اس کے لئے ہمارے اسلاف کی کوششیں

عزیزانِ گرامی قدر! میں نے عرض کیا تھا کہ آپ کے تعلق کا ایک سرا نبوتِ محمدی سے ملتا ہے،

اس سے آپ پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، میں نے ابھی تک اسی کی تفصیل بیان کی ہے، اسی کے ساتھ یہ عرض کیا گیا تھا کہ آپ کا دوسرا سرا زندگی سے ملتا ہے، اب میں عرض کروں گا کہ اس کی کیا ذمہ داریاں اور تیاریاں ہیں، اور آپ اس کے حقوق و فرائض سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔!

عزیزو اور دوستو! نبوت نے ہم کو جو علوم و حقائق اور جو اصول و ضوابط عطا کئے ہیں ان میں ایک شوشہ اور ایک نقطہ کی ترمیم ممکن نہیں، آپ کے اسلاف کا یہ تجدیدی کارنامہ ہے کہ انھوں نے ان میں کوئی تحریف اور کوئی تبدیلی نہیں ہونے دی اور اس ذخیرے کو ہمارے ہاتھوں تک بکم و کاست پہونچا دیا، لیکن اسی کے ساتھ اس حقیقت کو یاد رکھئے کہ ہمارے انھیں اسلاف نے ہر دَور اور ہر عصر میں اس ذخیرے کو زندگی میں منتقل کرنے کی کوشش بھی جاری رکھی، انھوں نے اپنی ذہانت اور محنت سے اس ذخیرے کو ایک زندہ، قابلِ عمل اور نموپذیر ذخیرہ ثابت کیا، انھوں نے اس کی ایسی ترجمانی اور تشریح کی کہ ان کی معاصر نسلوں کے دماغوں نے اس کو بآسانی قبول اور ہضم کر لیا، اور ان کو اپنے زمانہ، اپنی عقلی سطح اور اس ذخیرے کے درمیان کوئی تفاوت اور فاصلہ محسوس نہیں ہوا، ان میں اصل شریعت، مقاصدِ دین، اور منصوصات کے بارے میں پہاڑوں کی سی استقامت اور فولاد کی سی صلابت تھی، لیکن اس کی تعبیر و تشریح میں، اس کی توضیح و تفہیم میں شاخِ گل کی سی لچک اور ریشم کی سی نرمی تھی، ان کا عمل دراصل سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی اس حکیمانہ ہدایت پر تھا کہ "کلموا الناس علیٰ قدر عقولھم اتریدون ان یکذب اللّٰہ ورسولہٗ" اس لئے انھوں نے ہر زمانہ کی عقلی سطح کے مطابق دین کی تشریح و ترجمانی کا فرض انجام دیا، اور اس زمانہ کی نفسیات و ضروریات کا لحاظ کیا، تیسری صدی میں مامون و معتصم کی سرپرستی اور یونانی علوم کے اثرات سے معتزلہ دماغوں پر چھا گئے تھے، اور عقلیت کے واحد نمائندہ تصور کئے جانے لگے تھے، اعتزال زمانہ کا فیشن اور روشن خیالی کی علامت بنتا جا رہا تھا، اس وقت امام ابوالحسن اشعری نے

معتزلہ کی اس عقلی اجارہ داری کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا، اور شریعت وسنت کی حمایت و نصرت اور عقائدِ اہلِ سنت کا اثبات اسی زبان، انھیں اصطلاحات اور اسی اسلوب میں کرنا شروع کیا جس کے سہارے معتزلہ نے اپنا علمی تفوق اور ذہنی سیادت قائم کی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی مدت میں معتزلہ کا یہ عقلی طلسم ٹوٹ گیا، اور سنت وشریعت کے حلقوں میں جو احساس کہتری تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا وہ دفعۃً رک گیا، ابوبکر بن الصیرفی کا مقولہ ہے کہ۔

"معتزلہ نے بہت سر اٹھایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے مقابلہ کے لئے شیخ ابوالحسن اشعری کو پیدا کیا، انھوں نے اپنی ذہانت واستدلال سے ان کو بند کر دیا۔" اسی کارنامہ کی بناء پر ابوبکر اسمٰعیلی جیسے مبصرین نے ان کو مجددین امت میں شمار کیا ہے۔

امام ابوالحسن اشعری کے بعد ان کے مکتبِ خیال کے علماء نے ان کے کام کو جاری رکھا، اور قاضی ابوبکر باقلانی، شیخ ابواسحٰق اسفرائینی جیسے متکلم، اور علامہ ابواسحٰق شیرازی اور امام الحرمین جیسے مدرس واستاد پیدا ہوئے جنھوں نے اہلسنت کا علمی تفوق قائم رکھا لیکن اس عرصہ میں یونان کا علمی ذخیرہ عربی میں منتقل ہو چکا تھا، اور باطنیوں اور فلاسفہ نے مل کر فلسفہ کو تقدیس وعصمت کا جامہ پہنا دیا تھا، اور وہ عقلیت وحق کا معیار بن گیا تھا، ادھر علم کلام کے حلقہ میں جس کو سب سے زیادہ زمانہ شناس اور بیدار مغز ہونا چاہیئے تھا، جمود وتقلید سرایت کر گئی تھی، علماءِ کلام کو نہ صرف اس پر اصرار تھا کہ اشعری وماتریدی عقائد کو تسلیم کیا جائے، بلکہ اس پر بھی اصرار تھا کہ ان عقائد کو ثابت کرنے کے لئے بھی وہی مقدمات و دلائل اور وہی الفاظ و اصطلاحات استعمال کئے جائیں جو اشاعرہ وماتریدیہ نے استعمال کئے ہیں، حالانکہ زمانہ نئے دلائل اور نئے طرز استدلال اور نئے اجتہاد کا طالب تھا، امام ابوالحسن اشعری کا دور فلسفہ کا دور طفولیت تھا، اور عالم اسلام میں اس کا نیا نیا تعارف ہوا تھا، پانچویں صدی میں وہ

اپنے شباب کو پہونچ چکا تھا، اور زندگی میں اپنے پیچھے گرد چکا تھا، اس وقت ایک نئی شخصیت، نئے اجتہاد، تازہ دماغ اور نئے علم کلام کی ضرورت تھی، اس کے لئے انتظام خداوندی نے امام غزالی کو تیار کیا، امام غزالیؒ نے اپنی تصنیفات میں اصول وعقائد اسلامیہ پر نئے انداز سے گفتگو کی اور ان کے ثبوت کے لئے ایسے مقدمات ودلائل قائم کئے جو اس زمانہ کے لحاظ سے زیادہ موثر اور اپنے اثر کے لحاظ سے زیادہ دلنشیں ودل پذیر تھے، ان کے استدلال اور طریق بحث نے دین کا نیا وقار اور اہل سنت کا نیا اعتبار قائم کر دیا، اور ہزاروں بے چین اور مضطرب دماغوں کے لئے وہ سکون وایمان کا باعث ہوئے اگرچہ علم کلام کے حلقہ نے اس وقت ان کی اس اہم دینی خدمت کی داد نہیں دی بلکہ علم کلام کی پرانی لکیر سے ہٹنے کی بنا پر ان پر اعتراضات کئے جن کا جواب امام صاحب نے "فیصل التفرقة بین الاسلام والزندقة" میں دیا ہے، لیکن بالآخر عالم اسلام نے ان کے اس مجددانہ کارنامہ کا اعتراف کیا، امام صاحب نے فلسفہ کا جواب دینے کے لئے اس کی ضرورت سمجھی کہ وہ فلسفہ کے اصل ماخذوں کا براہ راست مطالعہ کریں، اور اس پر علمی تنقید کرنے کا استحقاق پیدا کر سکیں، چنانچہ انھوں نے دو سال لگ کر (جیسا کہ "المنقذ من الضلال" میں وہ لکھتے ہیں) فلاسفہ کے علوم کا گہرا مطالعہ کیا، اور باطنیہ کے عقائد وخیالات سے واقفیت پیدا کی، پھر انھوں نے اوّلؔ "مقاصد الفلاسفہ" — پھر "تهافة الفلاسفة" لکھی "تهافة الفلاسفة" میں انھوں نے نیا کام یہ کیا کہ ابھی تک متکلمین اسلام کی طرف سے مدافعت وجواب ہی کیا کرتے تھے، جو ہمیشہ سے ایک کمزور طریقہ ہے، امام غزالی نے پہلی بار فلسفہ کے شیش محل پر سنگ باری کی، ان کے اس حملہ کا اثر یہ تھا کہ بقول مغربی مورخین فلسفہ سو برس تک فلسفہ کی عمارت ان کے حملہ سے متزلزل رہی، اور تقریباً نوے سال کے بعد فلسفہ کے حلقہ نے ابن رشد کی کتاب "تهافت التهافت"

کی صورت میں امام غزالی کی کتاب کا جواب پیش کیا۔

امام غزالی کے بعد اس کی ضرورت تھی کہ فلسفہ کی بنیادوں پر منظم حملہ ہو، اور نفس فلسفہ کو اعتراضات کے تیروں سے چھلنی کر دیا جائے، اور ثابت کیا جائے کہ فلسفہ کا سارا نظام قیاس آرائی اور بادپیمائی سے زیادہ نہیں، اس کے لئے فلسفہ سے بڑی گہری اور وسیع واقفیت ایک بڑے نقاد دماغ اور ایک بڑے جری اور طاقت ور قلم کی ضرورت تھی، اس کام کے لئے شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ بڑھے، جو ہر طرح اس کے لئے موزوں تھے، انھوں نے اپنے مختلف رسائل بالخصوص اپنی تصنیف "الرد علی المنطقیین" میں فلسفہ اور اس کے پورے نظام فکر کو بے اعتبار ثابت کر دیا، ان کی مجتہدانہ کتابیں اب بھی ذہن کو نئی غذا، قلوب کو نیا اعتماد اور فکر کو تازگی اور نشاط بخشتی ہیں۔

ادھر فلسفہ اور علمِ کلام دونوں نے مل کر جو ایک عقلی ظاہریت اور سطحی تفلسف پیدا کر دیا تھا، اور عالمِ اسلام میں اس کے اثر سے یہ غلط خیال پیدا ہو گیا تھا کہ صداقت و یقین حاصل کرنے کا راستہ صرف استدلال و فکر ہے، اس کے خلاف مولانا جلال الدین رومیؒ نے قلمی جہاد کیا، ان کی زندہ جاوید مثنوی درحقیقت ساتویں صدی کے عقلی بحران کے خلاف قلب و روح کی ایک دلکش صدائے احتجاج ہے، اور نہ صرف علمِ کلام کی ایک مجتہدانہ تصنیف ہے، بلکہ نئے علمِ کلام اور نئے استدلال کی بنیاد ہے، انھوں نے عقائد و حقائقِ اسلامیہ کے ثبوت کے لئے نئے نئے دلائل اور نئی نئی مثالیں دی ہیں، جو بیک وقت قلب و دماغ دونوں کو متاثر کرتی ہیں، اور دونوں کی سلوٹوں کو دور کرتی ہوئی دلنشیں و جاگزیں ہوتی چلی جاتی ہیں، اس کتاب کی تاثیر ابھی تک باقی ہے، اور فلسفہ زدہ حلقوں میں اب بھی اس کے تیر بے خطا ہیں۔

مولانا رومؒ اور حافظ ابن تیمیہؒ کے بعد فلسفہ نے نئی کروٹ لی، اب وہ تصوفؒ اخلاق کی سرحدوں میں بھی گھس آیا اور سیاست و انتظام میں بھی دخل دینے لگا، اب اس کی تردید کے لئے تنہا الٰہیات کے مباحث اور علمِ کلام کی کاوش کافی نہ تھی، اب فلسفہ کے ہمہ گیر اثرات کا مقابلہ وہ کرسکتا تھا، جو یونانی الٰہیات کے ساتھ یونانیوں کے علم الاخلاق، مصر کی افلاطونیتِ جدیدہ اور اشراق، ہندوستان کے جوگ اور قرون وسطیٰ کے سیاسی تخیلات پر بھی ناقدانہ نظر رکھتا ہو، اور فلسفہ و تصوف، علم الاخلاق اور علم السیاست اور اسلام کے معاشی اصول اور نظامِ مالیات پر بھی اس کا مطالعہ وسیع اور نظر عمیق ہو، اس موقع پر حضرت شاہ ولی اللہؒ کی شخصیت نمودار ہوتی ہے جنھوں نے "حجۃ اللہ البالغۃ" اور "ازالۃ الخفاء" لکھ کر اسلام کی عظمت اور صداقت کا نقش قائم کردیا، اور علمی حلقوں میں اسلام کی نئی علمی ساکھ، علومِ اسلامیہ کی زندگی کا ثبوت اور طبقۂ علماء کا وقار قائم کردیا۔

۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کے تسلط سے نئے نئے فتنوں نے سر اٹھایا، عیسائی مبلغین نے اسلام پر علانیہ حملے شروع کردیئے اور علماء اسلام کو دعوتِ مقابلہ دی، پادریوں کا جواب دینے کے لئے اناجیل، ان کی تفاسیر اور ان کی تاریخ تدوین اور مسیحیت و اسلام کے مابہ النزاع مسائل و مباحث کے براہِ راست مطالعہ کی ضرورت تھی، اس موقع پر طبقۂ علماء ہی کے ایک فرد مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی میدان میں آئے اور انھوں نے "اظہار الحق" اور "ازالۃ الاوہام" جیسی کتابیں لکھ کر مسیحیت کی اشاعت میں ایک سنگِ گراں رکھ دیا، یہ کتابیں ہندوستان سے لے کر مصر و ترکی تک اپنے موضوع پر بے نظیر سمجھی جاتی ہیں، اور ابھی تک لاجواب ہیں۔

دوسری طرف آریوں نے جن کو حکومت وقت کی شہ مل گئی تھی، اسلامی عقائد و

الٰہیات پر نیا حملہ شروع کر دیا، اور عالم کے حدوث و قدم، ذات وصفات، کلامِ الٰہی، حیات بعد الموت اور تعیین قبلہ اور حیات نبویؐ پر عقلی اعتراضات کرنے شروع کئے، ان کے جواب میں نہ تو قدیم کلامی دلائل پورے طور پر کارگر تھے، نہ قدیم مقدمات اور قدیم اسلوب موثر تھا، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ان کے جواب کے لئے ایک نیا علم کلام تیار کر دیا، انھوں نے روزمرہ کی ہلکی پھلکی زبان میں چھوٹی چھوٹی مثالوں اور عام فہم دلیلوں میں بڑے بڑے علمی مسائل سمجھائے اور بڑے بڑے مباحث کا فیصلہ کیا، "تقریر دلپذیر"، "حجۃ الاسلام"، "آبِ حیات"، اور "قبلہ نما" ان کی ذہانت وسلامتِ فہم اور دقیقہ شناسی کا بہترین نمونہ ہیں، دوسری طرف انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں پنجاب میں ایک فتنہ کھڑا ہوا، یہ نبوتِ محمدی کے خلاف ایک سوچی سمجھی بغاوت تھی، اور اسلام کے پورے اعتقادی اور علمی و فکری نظام کو ڈائنامیٹ کرنے اور خدانخواستہ اس کے ملبہ پر ایک نئی نبوت اور امامت کے قصر کی تعمیر کی کوشش تھی، اس کے مقابلہ میں چند مخلص و بالغ نظر علماء میدان میں آئے، جن میں مولانا سید محمد علی مونگیریؒ بانیٔ ندوۃ العلماء اور مولانا سید انور شاہؒ کا نام اور کام سب سے زیادہ روشن ہے۔

زندگی کی رفاقت اور زمانہ کے تقاضوں کی تکمیل

یہ ساری تفصیل اس لئے سنائی گئی کہ آپ اندازہ کر سکیں کہ علماءِ اسلام کی ذہانت اور جذبۂ خدمت نے کبھی کسی منزل پر قیام اور کسی لکیر کا فقیر بننا گوارا نہیں کیا، انھوں نے علم کے چلتے پھرتے قافلہ کا ساتھ دیا، ان کا ہاتھ زمانہ کی نبض سے کبھی جدا نہیں ہوا، ان کی نگاہ زندگی کے بدلتے ہوئے تیوروں سے کبھی ہٹی نہیں، انھوں نے اسلام کی خدمت کے لئے جس زمانہ میں جس چیز، جس طرز اور جس اسلوب کی ضرورت سمجھی، بلا تکلف اختیار کر لیا، انھوں نے اسلام سے وفاداری

اور دین کی خدمت گذاری کا عہد کیا تھا، انھوں نے کسی مدرسۂ فکر، کسی مکتبِ خیال اور کسی انداز فکر سے وابستگی کی قسم نہیں کھائی تھی، ہندوستان و مصر میں جب اسلام پر تمدن و تہذیب اور تاریخ و ادب کی راہ سے حملے شروع ہوئے اور مغربی مصنفین اور مستشرقین نے اسلام کی مستند شخصیتوں اور اس کے معیاری عہد پر اعتراضات کئے، اور اسلام کے خد و خال کو بگاڑ کر بدنما شکل میں پیش کیا تو طبقۂ علماء ہی میں سے ایسے اہلِ قلم اور ادیب و مصنف آگے بڑھے جنھوں نے ان مضامین پر ایسی کتابیں لکھیں جو نہ صرف اسلامیات بلکہ اردو ادب میں بھی یادگار ہیں، اور جنھوں نے جدید تعلیم یافتہ اصحاب میں سے ہزاروں کو نیا اطمینان اور دماغی سکون عطا کیا، اور نہ صرف ان کا تذبذب دور ہوا، بلکہ اسلام سے شیفتگی پیدا ہو گئی، مولانا شبلی کی "الفاروق"، "الجزیہ فی الاسلام"، "کتب خانۂ اسکندریہ" اس سلسلہ کی کامیاب تصنیفات ہیں۔

نصاب تعلیم کے تغیرات

خود آپ کا نصابِ تعلیم اس حقیقت کا گواہ ہے کہ علماء اسلام نے کسی ضرورت کے تسلیم کرنے اور کسی مفید و ناگزیر چیز کو قبول کرنے میں کبھی پس و پیش نہیں کیا، یہ نصاب عہد بہ عہد تبدیلیوں اور مختلف علمی و عقلی رجحانات کا نمائندہ ہے، اس میں ہر دور میں اضافہ و ترمیم ہوتی رہی ہے، صرف یہ سو برس کا زمانہ ایسا ہے جس میں اس نصاب میں کم سے کم تبدیلی ہوئی ہے، حالانکہ یہی زمانہ اپنی سیاسی و ذہنی تبدیلیوں کی بنا پر جائز اور ضروری تبدیلیوں کا سب سے زیادہ مستحق و متقاضی تھا۔

دین کی نمائندگی کے لئے متنوع صلاحیتوں کی ضرورت

عزیزو! اس عہدِ انقلاب میں دین کی نمائندگی، تعلیمات اسلام کی ترجمانی اور نہ صرف

ان کی تشریح و تفہیم بلکہ ان کی بلندی و برتری کا نقش قائم کرنے کے لئے بڑی وسیع تیاریوں اور بڑی متنوع صلاحیتوں کی ضرورت ہے، آپ اسلام کے سپاہی ہیں، اور زندگی کے معرکہ کے لئے تیار ہو رہے ہیں، کسی فوجی تربیت گاہ اور وہاں کی تیار ہونے والی فوج کے لئے سب سے زیادہ ناموزوں سب سے زیادہ خطرناک بحث، قدیم و جدید اسلحہ اور طریق جنگ کی بحث ہے، سپاہی کے لئے نہ کوئی ہتھیار قدیم ہے نہ جدید، اس کو تو یہ دیکھنا ہے کہ میدان جنگ کے لئے کون سا ہتھیار کارگر ہے، اور کون سا طریق جنگ موزوں، تیار ہونے والے سپاہی کے لئے تعصب کی کوئی گنجائش نہیں، اس کا نہ کسی خاص اسلحہ سے رشتہ ہے نہ کسی خاص فن جنگ سے، اس کو تو تمام ضروری اسلحہ سے مسلح ہونا چاہیے، عرب شاعر نے بہت پہلے کہا تھا۔

کل امرئٍ یسعی الیٰ   یوم الهیاج بما استعدّا

نئی تحریکوں سے گہری اور ناقدانہ واقفیت کی ضرورت

آپ کو نئے فتنوں سے واقف ہونا چاہیے، مگر سطحی واقفیت عدم واقفیت سے زیادہ مضر ہے آج ہمارے مدارس میں فیشن کے طور پر بعض تحریکوں اور نظاموں کے نام لئے جاتے ہیں لیکن ان کے متعلق بہت کم معلومات ہیں، ناقدانہ نظر اور محققانہ مطالعہ تو بڑی چیز ہے، ان کی اجمالی حقیقت سے بھی واقفیت نہیں، ضرورت ہے کہ ماہرین فن اور اہل نقد و نظر کی نگرانی اور رہنمائی میں ان کا مطالعہ کیا جائے اور اسلام کے نظام کی برتری ثابت کی جائے، یہ کام مشکل ہے لیکن ضروری ہے اگر یہ مدارس کے اہتمام میں منظم طریقہ پر نہ ہوا تو وہ غیر منظم طریقہ پر ہوگا۔

نئے مطالعہ کی مشکلات اور ذمہ داریاں

ہمارے مدارس میں نئے مطالعہ کا رجحان بھی بڑھ رہا ہے مگر مجھے اس کا اظہار کرتے ہوئے

افسوس ہوتا ہے کہ اس میں کوئی سنجیدگی اور گہرائی نہیں، میں عصری مطالعہ کا بڑا داعی ہوں مگر بے تکلف کہتا ہوں کہ وہ اس قدر آسان اور سرسری کام نہیں، جتنا سمجھ لیا گیا ہے، اس کے لئے کتابوں کے صحیح انتخاب و ترتیب پر پوری رہنمائی اور کسی اچھے مشیر کی رفاقت کی ضرورت ہے، پھر اس سے پہلے اس کی ضرورت ہے کہ وہ ذہن تیار ہو جائے جو اس مطالعہ سے فائدہ اٹھا سکے، معلومات میں صحیح ترتیب و نظام قائم کر سکے اور ان کو صحیح طور پر استعمال کر سکے، اگر یہ ذہن صحیح تعلیم و تربیت اور اساتذہ کی صحبت سے تیار ہو گیا تو وہ ہر طرح کی پڑھی ہوئی چیزوں سے کام لے گا اور معلومات کے موادِ خام سے کارآمد مصنوعات اور عظیم نتائج پیدا کرے گا، اور ادب، تاریخ، معلوماتِ عامہ، یہاں تک کہ بہت سی غیر متعلق چیزوں سے دین کی نصرت اور خدمت کا ایسا موثر اور حیرت انگیز کام لے گا جو بعض اوقات خالص دینی چیزوں سے نہیں لیا جا سکتا، اس وقت "مِن بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِّلشَّارِبِيْنَ" کی حقیقت کا ظہور ہوگا، اگر ایسا نہیں ہے، دین کی بنیادیں قلب و دماغ میں مستحکم نہیں ہوئی ہیں، ذہن کج اور ذوق فاسد ہے تو۔ ؏

ہر چہ گیرد علتی علت شود

کا مصداق ہوگا۔

ملک کی زبان و ادب سے ربط و تعلق

اس موقع پر میں دو اور حقیقتوں کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

ایک حقیقت تو یہ ہے کہ کسی ملک میں دین کی خدمت و اشاعت اور وہاں کی زندگی پر اثر انداز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ دین کی خدمت کرنے والوں کو اس ملک کی زبان و

ادب کا صاف ستھرا ذوق ہو، اور وہ مذاقِ سلیم اور معیار کے صحیح کے مطابق اس میں اظہار خیال کرنے کی قدرت، جیتی جاگتی زبان اور شگفتہ اندازِ بیان میں تصنیف و تقریر کی قابلیت رکھتے ہوں، دین کی دعوت اس وقت بہت موثر ہو جاتی ہے، جب اس میں دل آویزی اور دلپذیری بھی ہو، اور یہ ایک ایسی نفسیاتی حقیقت اور امر واقعہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تک کو اپنی قوم کو خطاب کرنے اور ان کے دل و دماغ میں نفوذ کرنے کے لئے بہترین زبان دی گئی، قرآن مجید میں کہا گیا، "اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ" کہیں فرمایا گیا "بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ" کہیں ارشاد ہوا "وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ" اہل فکر سمجھتے ہیں کہ لسان القوم سے مراد صرف اتنا ہی نہیں کہ وہ ان کی سمجھ سکتا اور ان کو سمجھا سکتا ہو، بلکہ اپنے زمانہ کے اعلیٰ سے اعلیٰ لسانی اور ادبی معیار پر پورا اترتا، بلکہ سب سے فائق ہو، اس کی تصدیق اس سے ہوتی ہے کہ اس کے بعد ہی فرمایا "لِیُبَیِّنَ لَھُمْ" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "انا افصح العرب۔"

آپ جانتے ہیں کہ جن لوگوں نے اسلام کی تاریخِ اصلاح و تجدید میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا اور مسلمانوں کے خیالات و رجحانات پر گہرا اثر ڈالا، وہ عموماً زبان و قلم کی طاقت رکھتے تھے، اور ان کی تصنیفات یا تقریروں میں صحیح ادبیت اور بلاغت ہے، حضرت شیخ جیلانی کے مواعظ آج بھی زور بیان اور خطابت کا نمونہ ہیں، امام ربانی کے مکتوبات اپنی ادبیت، زور اور طاقت، سلاست اور بے تکلفی میں ابو الفضل اور فیضی کی انشا پردازی سے کہیں بڑھے ہوئے ہیں، شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی "حجۃ اللہ البالغہ" عربی انشاء اور علمی زبان کا ایسا نمونہ ہے کہ مقدمہ ابن خلدون کے بعد سے ان صدیوں میں اس سے بہتر نمونہ نظر نہیں آتا، شاہ صاحبؒ کی فارسی میں بھی خاص حلاوت اور سلاست ہے، "ازالۃ الخفاء" کے بعض ٹکڑے ادبی شہ پارے ہیں، یہ اس وقت کی

یا تیں ہیں، جب عربی اور فارسی اس ملک میں مسلمانوں کی تصنیفی اور علمی زبان تھی، اردو کے رواج کے بعد خود شاہ صاحب کے فرزندوں نے اردو میں تصنیف وتالیف کا کام شروع کیا، شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ دہلی کی ٹکسالی زبان کا بہترین نمونہ ہے، اور اپنی ادبی خوبیوں اور استناد کی بنا پر اردو کے کلاسیکل ادب میں خاص درجہ رکھتا ہے، مولانا محمد قاسم صاحب کی اردو تصنیفات میں ایسی سلاست، سادگی اور برجستگی پائی جاتی ہے کہ دقیق علمی مضامین بھی ذوق پر بار نہیں ہونے پاتے، اس ملک میں عرصۂ دراز تک زبان وادب کی قیادت طبقۂ علماء کے ہاتھ میں رہی اور وہی اس ملک کی ادبی رہنمائی کرتے رہے، خواجہ الطاف حسین حالی، مولوی نذیر احمد دہلوی اور مولانا شبلی نعمانی ادب اردو کے معماروں میں شمار کئے جانے چاہئیں، علماء نے اپنی لطافتِ ذوق، سلامتِ طبع، سخن فہمی اور انشاء پردازی کے ایسے نمونے چھوڑے ہیں، جو اردو کا قیمتی سرمایہ ہیں، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی رحمۃ اللہ علیہ کے مضامین اور مولانا سید عبدالحی ناظم ندوۃ العلماء کا "تذکرہ گل رعنا" اور "تاریخ یادایام" اردو نثر کا ایسا نمونہ ہے، جس میں تاریخی ثقاہت ومتانت اور ادبی بانکپن اور رنگینی پہلو بہ پہلو ہیں، اور یادش بخیر مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے تو اردو کو اپنی علمی تحقیقات اور ادبی مضامین سے گرانبار کر دیا، ان کی کتابیں اب بھی اور بہت دنوں تک نقدِ کامل عیار اور ادب وانشاء کا معیار سمجھی جائیں گی اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں نے اردو کو ایک نئی طاقت اور نیا اسلوب بخشا، "الہلال" کے سحرِ حلال نے ایک وقت میں سارے ہندوستان کو مسحور کر لیا تھا، اب بھی ان کا ایک ایسا ادبی مقام ہے، جو انھیں کے ساتھ مخصوص ہے، علماء کی اس بیدار مغزی اور زمانہ شناسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء پر اس ملک کی تعمیر وترقی سے علیحدگی اور اس کے رجحانات وجذبات سے بے خبری کا الزام نہیں لگایا جاسکا، انھوں نے اس ملک میں کبھی جزیرہ بننے کی کوشش نہیں کی، بعض دوسرے

اسلامی ملکوں کی طرح وہ زمانہ کے کارواں سے بچھڑے نہیں، انھوں نے اپنی دعوت اور دینی مقاصد کے لئے وہی زبان اختیار کی جو اس ملک میں رائج تھی، اور جو ادبی حلقوں میں اثر رکھتی تھی، ہمیں ان روایات کو قائم رکھنا چاہیے، اور اس مقدس ترکہ کی حفاظت کرنی چاہیے، ہم اگر اب بھی دین کی مؤثر خدمت انجام دینا چاہتے ہیں، اور اپنے عقائد و خیالات کو عوام و خواص تک پہونچانا چاہتے ہیں، تو ہمیں اپنی تصنیف و تقریر کے لئے شگفتہ و سلیس زبان اور نیا اسلوب اختیار کرنا پڑے گا، اور اپنی تصنیفات و مضامین اور تقریروں کو اس ادبی معیار پر لانا ہوگا جو اس زمانہ میں قائم ہوگیا ہے، یہ نہ ثقاہت کے خلاف ہے، نہ اسلاف کی روایت کے بلکہ حکمتِ دین کے عین مطابق ہے۔

عربی زبان پر قدرت

دوسری چیز یہ ہے کہ عربی زبان اس وقت ایک زندہ اور طاقتور زبان ہے، عرب ملکوں میں وہ اپنے پورے عروج اور شباب پر ہے، وہ تصنیف و تالیف، خطابت و تقریر، سیاست و صحافت، علم و فلسفہ اور دستور و قانون کی زبان ہے، وہ پورے طور پر نکھر گئی ہے، ہمارے عربی مدارس میں ایک غلط فہمی یہ پھیلی ہوئی ہے کہ قدیم عربی زبان تفسیر و حدیث و فقہ میں محدود ہے، اور وہ کہیں پائی نہیں جاتی، عربی کے نام سے بالکل ایک جدید زبان ایجاد ہوگئی ہے، جس میں زیادہ تر انگریزی و فرانسیسی کے معرّب یا دخیل الفاظ ہیں، اس غلط فہمی نے ہمارے بہت سے علماء اور نوجوانوں کو عربی سے متوحش اور مایوس بنادیا ہے، آپ اگر مجھ پر اعتماد کرسکیں، تو میں پورے وثوق کے ساتھ عرض کروں گا کہ جدید عربی کا کہیں وجود نہیں، اس وقت جو زبان اہلِ علم اور اہلِ قلم، شرق اوسط میں استعمال کرتے ہیں، وہ قرآن و حدیث اور جاہلیت و اسلام کی

زبان سے زیادہ سے زیادہ قریب ہے، نئی ضرورتوں کے لئے بھی انھوں نے عربی کے قدیم ذخیرہ اور قرآن وحدیث سے الفاظ نکال لئے ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے جو کام انجام دیا ہے، وہ حیرت انگیز بھی ہے، اور قابل داد بھی، مصر پر نپولین کے حملہ کے بعد سے جو مغربی الفاظ عربی زبان میں داخل ہو گئے تھے، وہ ایک ایک کر کے بے دخل کئے گئے اور ان کی جگہ پر خالص عربی الفاظ رکھے گئے، اس وقت ان ملکوں کا لسانی اور ادبی معیار اتنا بلند ہو گیا ہے، اور صحافت و اشاعت نے عربی کے خزانۂ عامرہ کے نوادر کو ایسا وقفِ عام کر دیا ہے کہ اب عربی میں کام کرنے کے لئے بڑی تیاری اور بڑی جدوجہد کی ضرورت ہے، ہمارے مدارس میں جس انداز پر عربی زبان وادب کی تعلیم ہو رہی ہے، اس کے ساتھ ان ملکوں میں کوئی علمی خدمت یا دعوتی کام ناممکن ہے، اگر آپ کو عربی دنیا میں دین کی دعوت و تبلیغ کا کام انجام دینا ہے یا ہندوستان کی دینی و علمی تحریکات کا تعارف کرانا ہے تو اس کے لئے بڑے پیمانے پر تیاری کی ضرورت ہوگی، اب ہندوستان ان ملکوں سے الگ نہیں رہ سکتا، دنیا کی سیاست میں شرقِ اوسط کو خاص اہمیت حاصل ہے، اور یہ اہمیت بڑھتی جائے گی، ہر ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے وہ اب بھی عالم کا قلب اور مرکز اعصاب ہے، اگر شرقِ اوسط سے ربط قائم کرنے اور دین اور مسلمانوں کی صحیح نمائندگی کرنے کے کام سے علماء نے گریز کیا تو یہ نہ ان کے حق میں اچھا ہوگا نہ اس ملک کے حق میں، اس لئے اس پہلو کی طرف بھی ہمارے مدارس میں خصوصی توجہ کی ضرورت ہے، زبان وادب زندہ اور متحرک چیزیں ہیں، کچھ مدت کے لئے بھی اگر کوئی ادارہ یا فرد ان سے بچھڑ جائے تو اس کو اس کا نقصان مدتوں برداشت کرنا پڑے گا۔

عقائدِ صحیحہ کی حفاظت

دوستو اور بھائیو! میں نے آپ کا بہت وقت لیا، لیکن "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم"۔

اب آپ سے رخصت ہونے سے پہلے میں ایک آخری چیز کہنا چاہتا ہوں، جو اگرچہ آخر میں کہی جارہی ہے، مگر وہ اہمیت میں کسی سے کم نہیں آپکے اور ہمارے اسلاف کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی دینی حس اور مذہبی غیرت کی حفاظت کی اور وقت کے کسی فتنہ کے سامنے سپر نہیں ڈالی، انھوں نے بدعات و رسوم اور شعائرِ جاہلیت کے معاملہ میں بھی مداہنت و تساہل سے کام نہیں لیا، آپ کے اسلاف میں حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جیسے جبلِ استقامت اور نقیبِ شریعت گزرے ہیں، جنھوں نے سب کچھ گوارا کیا، مگر کسی خلافِ شریعت فعل اور کسی بدعت کے ساتھ رعایت نہیں برتی، انگریزی حکومت کے تسلط کے بعد جب اس ملک پر مغربی تہذیب و عادات اور ملحدانہ عقائد و خیالات کا سیلاب آیا تو آپ چٹان کی طرح اپنی جگہ قائم رہے، آپ کے اسلاف شریعت کے بارہ میں اتنے ذکی الحس، اتنے دوربین اور اتنے غیور واقع ہوئے تھے کہ انھوں نے آخر وقت تک بدعات کو سندِ جواز نہیں دی، جو مسلمانوں کی زندگی کا جزو بنتی جاتی تھیں، انھوں نے محتسب اور شریعت کے بے لاگ منتظم کے فرائض انجام دیئے اور ان کی نگاہِ احتساب سے کوئی انحراف اور کوئی بدعت بچ کر نہیں نکل سکی، انھوں نے عوام کا عتاب، لوگوں کی ملامت، تکفیر کے فتوے، مقاطعہ اور ایذا رسانی سب کچھ گوارا کیا، مگر اپنے مسلک کو نہیں چھوڑا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج لاکھوں کی تعداد میں ایک طبقہ جو زیادہ سنجیدہ، باوقار اور صاحبِ فکر ہے، ان بدعات سے محفوظ ہے، اور یہ بدعات ابھی تک مسلمانوں کی زندگی میں مستند اور مسلم نہیں ہو سکیں، اللہ تعالیٰ ان خادمینِ شریعت اور ان محافظینِ دین کی تربتیں ٹھنڈی رکھے، اور ان کو امت کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

آج ہمیں ان کی بصیرت، ان کی فراست، ان کے دینی تفقہ اور ان کے رسوخ فی العلم کی قدر آتی ہے کہ انھوں نے اپنا فرض کس خوبی سے انجام دیا۔ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا۔

مجھے پہلے تو آپ سے یہ کہنا ہے کہ یہ آپ کا بڑا عزیز اور محبوب سرمایہ ہے، انھوں نے اپنی جانوں کو حصار بنا کر اس باغ کی حفاظت کی ہے، انھوں نے اپنے خون سے اس کے درختوں کو سینچا ہے، اور ہمیں بتلا دیا کہ شریعت کے باغ کی رکھوالی اس طرح کی جاتی ہے ؎

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخون دل
قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

ہمیں اس سرمایہ کو سینہ سے لگا کر رکھنا چاہیے، اور اپنے ہر سرمایہ سے زیادہ اس سرمایہ کو عزیز رکھنا چاہیے، مجھے آپ سے دوستانہ شکایت ہے، میرے دردمند دل کو آپ سے گلہ ہے کہ آپ اس سرمایہ سے بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں، آپ کے بزرگوں کی بہترین صلاحیتیں، اور مبارک ترین اوقات ان نفوس قدسیہ کی طرف سے حمایت و مدافعت میں گزرے، آپ انھیں کی بدولت ایک بڑے گروہ میں معتوب و مغضوب ہوئے، اور آپ کے ساتھ اب بھی یہ نسبت لگی ہوئی ہے، مگر اب آپ میں بہت سے ان کے نام اور کام سے بھی واقف نہیں، آپ میں سے کتنے مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے حالات اور کارناموں سے واقف ہیں؟ آپ میں سے کتنے بھائیوں نے "صراط مستقیم" اور "تقویۃ الایمان" پڑھی ہے؟ آپ میں سے کتنے بھائی توحید و سنت کی

صحیح حقیقت سے واقف ہیں، وہ بتلا سکتے ہیں کہ اہلِ جاہلیت کے ایمان باللہ کی حقیقت کیا تھی، اور قرآن نے کیوں ان کو مشرک کہا توحید کے کیا مراتب ہیں، اور شرک کے کیا مظاہر ہیں، بدعت کی جامع و مانع تعریف کیا ہے، اور اس کے کیا نقصانات ہیں، آپ کو ان سب مسائل پر تیار ہونا چاہئے تھا، اور آپ کا مطالعہ اور آپ کی بصیرت عوام سے اس بارہ میں بہت ممتاز ہونی چاہئے تھی، مگر مجھے خطرہ ہے کہ آپ میں سے بہت سے بھائی ان چیزوں سے بالکل خالی الذہن ہوں گے۔

نئے دور کے نئے فتنے

اسی کے ساتھ ایک دوسری حقیقت یہ ہے کہ اب نیا دور نئے فتنے لا رہا ہے، جاہلیت نئے روپ میں ظاہر ہو رہی ہے، پہلے اگر بدعات کا معاملہ تھا تو اب کھلی کھلی وثنیت اور اصنامِ قدیمہ کا دَور دَورہ ہے، پہلے اگر ہمہ اوست کا نعرہ تھا تو اب وحدت ادیان کا فتنہ، احیا پرستی کی دعوت، قوم پرستی، قومیت عربیہ اور کمیونزم کا دین جدید ہے......

.... یہ حالات ہمارے احساسِ مذہبی، ہماری حمیتِ دینی اور ہمارے عقیدۂ توحید کو چیلنج کرتے ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ جنھوں نے بدعات و رسوم مروجہ کو کبھی گوارا نہیں کیا، وہ ان مشرکانہ رسوم و مظاہر کو کس طرح گوارا کرتے ہیں، اور ان کا رویہ اس بارہ میں کیا ہوتا ہے، ہم اپنے اسلاف کے دینی تصلب اور دینی شجاعت کے معترف ہیں، اور خدا اور خلق کے سامنے اس کی گواہی دینے کے لئے تیار ہیں کہ انھوں نے باطل کے سامنے گردن نہیں جھکائی، اور ہتھیار نہیں ڈالے، دیکھنے کی بات ہے کہ ہمارے بعد کی نسلیں ہمارے متعلق کیا رائے قائم کرتی ہیں، اور ہم تاریخ میں کیسے نقوش چھوڑ کر جاتے ہیں۔

دَورِ جدید کی ذمہ داریاں

عزیزو اور رفیقو! تقدیرِ الٰہی نے ہمارے لئے جس دور کا انتخاب کیا ہے، اس کی ذمہ داریاں

بہت بڑھی ہوئی ہیں، لیکن اس کا انعام اور اس کی سرفرازیاں بھی بہت بڑھ چڑھ کر ہیں، ذمہ داریوں سے گریز اور زمانہ سے شکست مردوں کا کام نہیں، جو وقت باقی رہ گیا ہے اس کو تیاری میں صرف کیجئے، خدا نے آپ کو بہترین مربّی اور شفیق استاد دیئے ہیں، ایک دینی ماحول اور ایک بہت بڑا ادارہ بخشا ہے، زمانہ کی نزاکت اور اپنے کام کی عظمت سمجھئے، اور اپنے کو قیمتی اور کارآمد بنایئے، تاکہ امت کے لئے قیمتی اور کارآمد ثابت ہوں ؎

غافل منشیں، نہ وقت بازیست
وقتِ ہنر است و کارسازیست

عصرِ جدید کا چیلنج

اور

اس کا جواب

۱۲ر اگست ۱۹۷۲ء کی شب کو دارالعلوم دیوبند کے دارالحدیث کے وسیع ہال میں مولانا نے طلبہ کو خطاب کیا، جلسہ کی صدارت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت بہار و اڑیسہ نے فرمائی، جلسہ میں متعدد ارکان شوریٰ، بڑے اساتذہ اور اہتمام کے متعدد ذمہ دار شریک تھے، طلبہ بہت بڑی تعداد میں موجود تھے، تقریر ٹیپ کر لی گئی تھی، اس کو بڑی محنت سے مولوی واحد فیاض جلال پوری و مولوی محمد شعیب خاں کوٹی وغیرہ نے ٹیپ سے قلمبند اور مرتب کیا، مولانا نے اس پر تفصیل کے ساتھ نظرِ ثانی فرمائی ہے حسب ضرورت ترمیم و تشریح سے بھی کام لیا اور ذیلی عنوانات قائم کئے، بعد میں، یہ تقریر مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی طرف سے رسالہ کی شکل میں بھی شائع ہوئی، اور اب اس مجموعہ کی زینت ہے۔

عصرِ جدید کا چیلنج

اور

اس کا جواب

خطبۂ مسنونہ اور حمد و صلوٰۃ کے بعد:

جناب صدر! عزیز طلبہ!

دیرینہ و عزیزانہ روابط

دار العلوم دیوبند کے طلبہ کے سامنے کچھ عرض کرنا عزت و مسرت کی بات بھی ہے، اور ذمہ داری و مسئولیت کی بھی، مجھے مختلف اداروں، اور دانش گاہوں یونیورسٹیوں سے لے کر عربی مدارس تک کے طلبہ سے عرض معروض کرنے کا موقعہ ملا ہے، لیکن بلا تکلف عرض کرتا ہوں کہ مجھے آپ کے سامنے کچھ کہنے میں بڑی ذمہ داری محسوس ہوتی ہے، میں اس اعزاز و اعتماد کی جس کا آپ نے اظہار کیا ہے، قدر کرتا ہوں، میں خدا کے سامنے سجدہ ریز، اور ثنا خواں ہوں کہ جو کبھی یہاں طالب علم کی حیثیت سے حاضر ہوتا تھا، اور اپنے لئے اس کو بڑی سعادت کی بات سمجھتا تھا، اس کو اس وقت خطاب کرنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے، ابھی شاید یہ فاشعار، اور دردآشنا سرزمین مجھے بھولی نہ ہوگی، میں اس سعادت و توفیق پر بھی اللہ تعالےٰ کے سامنے سجدۂ شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے یہاں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کی زندگی میں طالب علمانہ

اور نیاز مندانہ حاضری' اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کی توفیق عطا فرمائی' میں اس کو اپنے لئے سرمایۂ سعادت سمجھتا ہوں' اور اس سے اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی امیدیں رکھتا ہوں۔

میں اس بات پر جتنا فخر کروں کم ہے' لیکن میری نیاز مندی کی تاریخ اس سے زیادہ وسیع اور طویل ہے' کئی پشتوں سے میرا تعلق اس درسگاہ عالی مقام سے رہا ہے' یہاں کی زمین ان لوگوں کے آنسوؤں سے نم' اور یہاں کی فضا ان کی دعاؤں' اور آہوں سے اب بھی معطر ہوگی' جو قافلہ[1] بنا کر اس سرزمین سے گذرے۔

مجھے اس اعزاز' اور اس ذمہ داری دونوں کا احساس ہے لیکن میں اپنے آپ کو آپ سے الگ نہیں سمجھتا' میں پہلے بھی طالب علم تھا' اب بھی طالب علم ہوں' اور طالب علم ہی رہنا چاہتا ہوں' میری زندگی علم اور طالبان علم کے ساتھ وابستہ کر دی گئی ہے' اور میں چاہتا ہوں کہ یہ سلسلہ ہمیشہ قائم رہے' میں آپ سے انھیں الفاظ میں جو کبھی زبان نبوت سے حضرات انصار' اور اہل مدینہ کے لئے نکلے تھے' کہہ سکتا ہوں کہ:۔

المحیا محیاکم' والممات مماتکم　　جینا بھی تمہارے ساتھ ہے' اور مرنا بھی تمہارے ساتھ ہے۔

خدا میری یہ دعا اور آرزو پوری کرے۔

دارالعلوم دیوبند کے قیام کا اصل محرک' حمیت دینی

طلبائے عزیز! آپ دارالعلوم دیوبند کے طالب علم ہیں' میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ آپ کی درسگاہ کی بنیاد کس چیز پر پڑی؟ آپ کی درسگاہ کا طرۂ امتیاز کیا ہے؟ یقیناً آپ کے پاس

---

[1] اشارہ سید احمد شہیدؒ' اور ان کے رفقاء (مولانا اسمٰعیل شہیدؒ' اور مولانا عبدالحئیؒ صاحب وغیرہم) کی طرف ہے جن کا کئی روز اس قصبہ میں قیام رہا (ملاحظہ ہو سیرت سید احمد شہیدؒ جلد اول باب "دوآبہ کا دورہ")

اس کے لئے بڑے بڑے معقول اور ناقابل تردید جوابات ہوں گے آپ اگر کہیں کہ علم پر اس کی بنیاد پڑی تو کون اس کا انکار کرسکتا ہے؟ آپ اگر کہیں کہ اخلاص پر اس کی بنیاد پڑی تو کون اس کی تردید کرسکتا ہے؟ اگر آپ کہیں کہ احیاء سنت اور مخالفت بدعت پر یا علم حدیث کی ایک خاص طرز کی خدمت پر اس کی بنیاد پڑی تو اس میں بھی کسی اختلاف کی گنجائش نہیں، یہ ساری چیزیں قابلِ صد احترام ہیں اور ان پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے لیکن یہ وہ چیزیں ہیں جن میں ہندوستان کے اکثر دینی مدارس دارالعلوم کے شریک ہیں، مرتبہ و مقام کا فرق ضرور ہوگا لیکن مدارس عربیہ کی بنیاد عام طور پر انھیں مقاصد پر رکھی گئی ہے، انھیں کی طرف ان کا انتساب ہے اور یہی ان کی حقیقی قدر و قیمت ہے۔

لیکن جس امتیاز پر آپ کے مدرسہ کی بنیاد پڑی اور جو اس کا حقیقی سنگ بنیاد ہے، (وہ سنگ بنیاد نہیں جو اہل ثروت اور اہل وجاہت سے رکھوایا جاتا ہے اور جس کے لئے بڑے بڑے جلسے اور تقریبیں منعقد کی جاتی ہیں) وہ دین کی حمیت اور اسلام کی حفاظت کا جذبہ تھا، یہ ہے اس دارالعلوم کا سب سے بڑا طرۂ امتیاز۔

مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم کے خطرے کا مقابلہ

اس وقت جبکہ ہندوستان پر ایک نئی تہذیب کا حملہ اور یہاں ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا تھا، اس وقت اس دارالعلوم کی بنیاد پڑی، دارالعلوم کی بنیاد درحقیقت اس احساس پر تھی کہ اب ہندوستان میں جو دور آنے والا ہے، وہ ایمان بالغیب کا دور نہیں ہوگا، وہ دور محمد عربی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو "دانائے سُبل، ختم الرسل، مولائے کل"[۱] سمجھنے کا دور نہیں ہوگا، اس دور کی

---

[۱] اشارہ اقبال کے اس شعر کی طرف ہے ؎

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے غبار راہ کو بخشا فروغِ وادی سینا

بنیاد ختم نبوت اور اس عقیدہ پر نہیں ہوگی کہ آپ آخری پیغمبر اور آپ کی شریعت آخری شریعت ہے، بلکہ اب جو دور شروع ہو رہا ہے، اس کی بنیاد مادی زندگی کو اصل ماننے اور محسوسات و ظواہر کی پرستش پر ہوگی۔

صحیح میدان عمل کا انتخاب

اس وقت جبکہ سلطنت مغلیہ کا چراغ گل ہوگیا تھا، اس وقت کے روشن ضمیر علماء نے اس حقیقت کو سمجھا کہ اس دم توڑتی ہوئی قوت میں جان ڈالنے میں اپنا وقت صرف کرنا، اور اس ٹمٹماتے چراغ کو جس کا تیل ختم ہوگیا ہے، اور بتی جل گئی ہے، دوبارہ بھڑکانا نہ صرف مشکل، بلکہ لاحاصل کام ہے، اس لئے کہ کسی ایسے خشک درخت کو جو زندگی کی صلاحیت سے محروم، اور اس کا نمو ختم ہو چکا ہے کسی "ہرا رے" سے چھڑکاؤ کر کے اور کسی خارجی تدبیر سے شاداب اور قائم نہیں رکھا جا سکتا، گویا ان کے سامنے فلسفی مؤرخ ابن خلدون کا یہ حکیمانہ مقولہ تھا کہ "ان الھرم اذا نزل بالدولۃ لا یرتفع" (جب کوئی سلطنت بوڑھی اور از کار رفتہ ہو جاتی ہے تو پھر اس کو از سر نو جوان نہیں کیا جا سکتا) وہ یہ سمجھتے تھے کہ کوئی بڑی سے بڑی مسیحائی کسی جاں بہ لب ادارہ کو جو اپنی زندگی کے دن پورے کر چکا ہے، زندہ نہیں رکھ سکتی، انھوں نے اپنی صلاحیتوں اور وسائل کا دیانتدارانہ اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیا، اور اپنی طاقتوں کو سوچ سمجھ کر اسلامی تہذیب اور اسلامی علوم کی حفاظت کے مقصد پر مرکوز کر دیا، ان کو یقین تھا کہ ہم کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ زندگی کا جو آئین دیا گیا ہے، اور جو کتاب عطا کی گئی ہے جو قانونِ شریعت ملا ہے، ہمیں جس تہذیب کا وارث بنایا گیا ہے، ہمیں جو محکمات اور اصول عطا کئے گئے ہیں، ان کے لئے بہار و خزاں، جوانی اور بڑھاپے، ترقی اور تنزل، تغیر و تبدل، اور

موت وحیات کا یہ قانونِ طبعی نہیں، جو ساری کائنات میں کارفرما ہے۔

لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا	اس پر جھوٹ کا دخل نہ آگے سے ہو سکتا ہے اور
مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ	نہ پیچھے سے (اور) دانا (اور) خوبیوں والے (خدا)
(سورۂ حٰم سجدہ۔۴۲)	کی اتاری ہوئی ہے۔

اس کی حقیقت یہ ہے:۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ	آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کردیا
عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ	اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کردیں اور تمہارے
دِيْنًا۔ (سورہ المائدہ۔۳)	لئے اسلام کو دین پسند کیا۔

اس کے دوام اور بقاء کی ضمانت اور اعلان ہے، انھوں نے ساری طاقت علوم اسلامیہ کی حفاظت اور اس تہذیب کو نہ صرف اپنی جگہ برقرار رہنے، بلکہ اس کے دائرہ کو وسیع کرنے اور زندگی سے اس کا ربط قائم رکھنے پر صرف کردی، توفیق الٰہی کی یہ خاص یاوری اور دستگیری تھی کہ انھوں نے اپنی جدوجہد کے لئے صحیح میدان کا انتخاب کیا، یہاں پر ایک لغزش سیکڑوں برس پیچھے ڈال سکتی تھی، اور پھر کبھی اس کی تلافی نہیں ہوسکتی تھی۔

مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا اصل امتیاز

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتوی، اور ان کے عالی مقام رفقاء حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ وغیرہ کے اندر جو جذبہ کارفرما تھا، وہ حمیت اسلامی کا جذبہ تھا، اسی نے ان سے اس دارالعلوم کی بنیاد رکھوائی، مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو دینی علوم میں اجتہاد کا مقام حاصل تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو علم کلام، اور معارف الٰہیہ میں دیدہ وری، اور نکتہ سنجی کی غیرمعمولی دولت سے

نوازا تھا جس کی شاہد ان کی کتابیں "آب حیات" "تقریر دل پذیر" اور "حجۃ الاسلام" ہیں لیکن ان کا سب سے بڑا امتیاز یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حمیت اسلامی کے جوہر سے حصۂ وافر عطا فرمایا تھا اور اللہ نے ان کو ایک بے چین روح، اور ایک مضطرب دل عطا فرمایا تھا، وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان جس پر ہمارے اسلاف کی بہترین صلاحیتیں صرف ہوئی ہیں اور جس نے اسلام کی خدمت اور دینی علوم کے میدان میں وہ کارنمایاں انجام دیئے جن کی نظیر بڑے بڑے اسلامی ملک نہیں پیش کر سکتے، تاریخ کے پچھلے دور میں وہ مسلمانوں کی ذہانت، ان کی قوت اجتہادی، ان کی اولوالعزمی، اور حوصلہ مندی کے اظہار کا سب سے بڑا میدان رہا ہے، اس نے علوم اسلامیہ کی خدمت میں حصہ ہی نہیں لیا، بلکہ ان میں اضافہ کیا ہے، اس نے اسلامی کتب خانوں کو بعض وہ کتابیں دیں جن کی مثال اسلام کی پوری علمی تاریخ میں نہیں ملتی، کیا اس وسیع ملک کو اس آسانی کے ساتھ مغربی تہذیب کی تحویل، اور اس کے علم برداروں کے چارج میں دے دیا جائے؟ کیا ہم اپنی ان آنکھوں سے دیکھیں کہ مسلمان خاندانوں کے نونہال، صدیقی، فاروقی، علوی، عثمانی، اور سادات و شیوخ کے گھرانوں کے چشم و چراغ، جن کے اسلاف کرام کی کوششوں کی بدولت لاکھوں انسانوں کو اسلام کی ہدایت، اور علم کی دولت نصیب ہوئی، جنھوں نے اسلام کے چراغ کو اپنے سینے سے لگائے رکھا، اور بڑی بڑی آندھیوں اور طوفانوں میں بھی اس کو گل ہونے نہ دیا، اسلامی تہذیب و معاشرت، اور سنت و شریعت سے رشتہ توڑ کر خالص مادہ پرست انگریزوں کے قبضے میں چلے جائیں، اور وہ ان کو اپنی نئی تہذیب و تعلیم کے سانچہ میں ڈھال کر مسلمانوں، یا صحیح الفاظ میں دنیاداروں کی ایک نئی نسل تیار کر دیں، جس کو نام اور قومیت کے سوا کسی چیز میں سابق نسل سے کوئی مناسبت اور مشابہت نہ ہو؟

یہ سوال تھا، جو مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے سامنے ایک مسئلہ بن کر کھڑا ہو گیا، یہ مسئلہ محض ایک مدرسہ، اور تعلیم گاہ کے قیام کا نہیں تھا، میں سمجھتا ہوں کہ دار العلوم دیوبند کے حق میں "ازالۂ حیثیت عرفی"

کا جرم ہوگا، اگر کہا جائے کہ دارالعلوم چند مخصوص کتابوں کے پڑھنے پڑھانے، اور درس و تدریس کے ایک مرکز کی حیثیت سے قائم ہوا تھا، اس سے بڑھ کر اس کے بانیوں کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوسکتی، ایسا کہنے والوں کو ان بزرگوں کی روحوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا، جس وقت یہ کہا جاتا تھا کہ یہ محض ایک مدرسہ ہے، تو حضرت شیخ الہند تڑپ اٹھتے تھے، ان کے نزدیک یہ اسلام کا ایک قلعہ، اس کے داعیوں اور مجاہدوں کی تربیت کی ایک چھاؤنی، اور سلطنت مغلیہ کے گل ہونے والے چراغ کا بدل، بلکہ نعم البدل تھا۔

بس مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے سامنے اصل مسئلہ یہی تھا کہ کیا ہندوستان کو ان مغربی غارتگروں کے ہاتھ میں دے دیا جائے؟ کیا ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہیں کہ ہمارے جگر کے ٹکڑے، جنھوں نے ہمارے خون جگر سے پرورش پائی، جن کی رگوں میں علماء اور اولیاء کا خون دوڑ رہا ہے، ان کالجوں اور یونیورسٹیوں کے قبضے میں چلے جائیں، اور مغربی تہذیب اور تعلیم کے سائے میں پروان چڑھ کر، اور ہم سے مکمل طور پر بیگانہ و ناآشنا ہو کر نکلیں؟ انھوں نے انگریزی حکومت کے اس چیلنج کو قبول کیا، اور بالکل اپنے جد امجد صدیق اکبرؓ کی زبان میں یہ کہا کہ:-

أينقص الدين وأنا حيٌّ — کیا خدا کے دین میں میرے جیتے جی کتر بیونت کیجا سکتی ہے۔

ان کی صحیح ترجمانی یہی فقرہ کرتا ہے، جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے حضرت ابوبکرؓ کی زبان سے نکلا تھا، اس فقرہ نے تاریخ کے دھارے کو بدل دیا، اور زمانہ کی کلائی موڑ دی تھی، یہ ایک مختصر سا فقرہ نہیں، ایک دور کا عنوان، اور ایک تاریخ کا خلاصہ ہے، اگر صدیق اکبرؓ کی کوئی سیرت و سوانح نہ لکھی جاتی تو یہی ایک فقرہ ان کی مکمل سیرت و سوانح بن سکتا تھا، یہ ایک الہامی فقرہ تھا، جو ان کی زبان سے نکلا، ایک شیر تڑپ کر جست لگا کر دہاڑتا ہے جس سے سارا جنگل کانپ جاتا ہے، اس سے زیادہ

جلال وصولت اور اس سے زیادہ شجاعت وغیرت اس فقرہ میں ہے، میں سمجھتا ہوں کہ دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء کے بانیوں کی جو چیز رہنمائی کر رہی تھی، وہ یہی احساس تھا، ان کا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا کہ وہ صرف و نحو کی تعلیم اور علوم عالیہ و آلیہ کی مجرد تدریس کے لئے مرکز قائم کریں، اس کے لئے مصر کا جامع ازہر، تیونس کا جامع زیتونہ، مراکش کا جامعۃ القرویین اور ہندوستان کے کئی بڑے بڑے مدارس موجود تھے، ان کی ٹکر کا کوئی مدرسہ قائم کرنا اور اس بے سروسامانی کی حالت میں محض تعلیم و تعلم کے لئے کوئی دانشمندانہ فعل اور کوئی جرأت مندانہ اقدام نہ تھا۔

غیر منقطع رشتہ اور ناقابل شکست عہد

یہی دینی حمیت تھی جس نے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو بے چین بنا رکھا تھا، اور انھوں نے مدرسہ قائم کیا، اس مدرسہ نے ایک بہت محدود اور غیر محسوس طریقہ پر کام کا آغاز کیا، جس کا احساس اس زمانہ کے اچھے اچھے صاحب نظر لوگوں کو بھی شاید نہ ہوا ہو لیکن اس کا مقصد بہت عظیم تھا، وہ مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب، اسلامی معاشرت، علوم دینیہ اور شریعت اسلامیہ کے لئے ایک قلعہ تعمیر کریں، اور اس دعوت کو متعدی بنائیں۔

وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ — اور یہی بات اپنی اولاد میں پیچھے چھوڑ گئے

لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ۔ (الزخرف ۲۸) — تاکہ (خدا کی طرف) رجوع کریں۔

ان کی ان تمام کوششوں کا ماحصل اور مطمح نظر صرف یہ تھا کہ اس ملک کے مسلمان جب تک زندہ رہیں، ان کا رشتہ ملت ابراہیمی، اور شریعت محمدی سے استوار رہے، وہ اسی دین و آئین کے پابند ہوں جو خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ سے ان کو ملتا ہے، اور جب وہ دنیا سے رخصت ہوں تو وہ اسی دین کے وفادار اور حلقہ بگوش ہوں، یہ گویا

اسی وصیت اور عہد نامہ کی تعمیل تھی جس کا قرآن شریف میں تذکرہ ہے۔

وَوَصّٰى بِهَا اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَـكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؕ (سورۃ البقرہ۔ ۱۳۲)

اور ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اسی بات کی وصیت کی اور یعقوب نے بھی (اپنے فرزندوں سے یہی کہا) کہ بیٹو خدا نے تمہارے لئے اسی دین کو پسند فرمایا ہے تم مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔

نیا زمانہ، نئے فتنے

عزیزان گرامی! آپ کی درسگاہ کی بنیاد حمیت اسلامی پر پڑی، آپ کی درسگاہ کی بنیاد زمانہ کے چیلنج کے قبول کر لینے پر پڑی، اب زمانہ کے نئے چیلنج کو آپ نظر انداز نہیں کر سکتے، کم سے کم دار العلوم دیوبند، اور ندوۃ العلماء کے لئے اس چیلنج کو نظر انداز کرنے کا کوئی جواز نہیں، اس لئے کہ ان کی بنیاد ہی زمانہ کے چیلنج کو قبول کرنے پر پڑی تھی، مغربی تہذیب اور معاشرت، اور انگریزی تعلیم جس کے ساتھ کسی قسم کی مذہبی رہنمائی اور اخلاقی تعلیم و تربیت کا انتظام نہیں تھا، اس زمانہ کا فتنہ تھا۔

لیکن فتنے کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں، اور ایک ہی فتنہ ہمیشہ نہیں ہوتا، نئے نئے فتنے سر اٹھاتے ہیں، اور اسلام اور مسلمانوں کے لئے نئے نئے خطرے سامنے آتے ہیں، جاہلیت نئے نئے روپ میں سامنے آتی ہے، اور بڑے دم خم کے ساتھ میدان میں اترتی ہے، اقبال نے غلط نہیں کہا تھا ؎

اگرچہ پیر ہے مومن، جواں ہیں لات و منات

بڑی خطرناک بات ہے کہ لات و منات یعنی باطل طاقتیں، اور جاہلیت قدیم تو زندگی اور جوش و خروش سے بھرپور ہوں، اور مومن میں جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا وارث اور نائب ہے، کہنگی اور فرسودگی، پستی اور افسردگی، کنارہ کشی اور پسپائی کی ذہنیت پیدا ہو جائے، لات و منات

نئے دم خم کے ساتھ نئی امنگوں اور ولولوں کے ساتھ نئی تیاریوں اور نئے طریقوں کے ساتھ، نئے نعروں اور نئی للکاروں کے ساتھ میدان میں آئیں اور مومن پر موت کی نیند طاری ہو جائے، اس کے قویٰ میں افسردگی اور اضمحلال پیدا ہو جائے، وہ زندگی کے میدان سے فرار اختیار کر کے یا کنارہ کش ہو کر کسی گوشۂ عافیت کو تلاش کرلے، جہاں وہ اپنی زندگی کے دن گذار سکے، اور لات و منات خم ٹھونک کر میدان میں کھڑے ہوں، اور دعوت مبارزت دے رہے ہوں۔

عہد جدید کا فتنۂ کبریٰ

حضرات! اس زمانہ کا فتنہ اور چیلنج کیا ہے؟ اس زمانہ کا چیلنج یہ ہے کہ اسلام کو اس کی جداگانہ تہذیب، اس کی مخصوص معاشرت، اس کے عائلی قانون، اس کے نظام تعلیم، اس کے زبان و ادب، اور رسم الخط، اور اس کے پورے ورثہ سے الگ کر دیا جائے، اور اسلام چند عبادات، اور چند رسوم و تقریبات کا (جو بعض مذاہب کا کل سرمایہ، اور بعض قوموں کا واحد مذہبی نشان ہے) مثلاً شادی اور غمی میں کیا ہونا چاہیئے، مردے کو کس طرح آخری مرحلہ سے گذارا جائے وغیرہ وغیرہ بس اسلام انھیں مذہبی و معاشرتی رسوم (RITES) کا مجموعہ بن کر رہ جائے، میں نہیں جانتا کہ کل کیا ہو، لیکن پھر بھی اندازہ ہے کہ شاید ابھی یہ مرحلہ دور ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں سے کہا جائے کہ آپ کو نماز پڑھنے کی اجازت نہیں، آپ کو کوئی خاص عقیدہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں، آپ روزہ نہیں رکھ سکتے، آپ زکوٰۃ نہیں دے سکتے، لیکن وہ مرحلہ ضرور آ گیا ہے کہ مسلمانوں سے اشارے اور کنایہ سے، اور کبھی کبھی صاف کہا جاتا ہے کہ مسلمان اپنی رضا و رغبت سے اپنی جداگانہ تہذیب اور ہر اس چیز سے بے تعلقی اختیار کر لیں جو ان میں ایک الگ ملت، اور ایک مستقل تہذیب کا وارث ہونے کا احساس پیدا کرتی ہے، وہ خود ہی اعلان کر دیں کہ ہم کسی جداگانہ تہذیب کے

حائل نہیں ہیں، وہ خود اپنے عائلی قانون (پرسنل لا) میں اصلاح و ترمیم کا مطالبہ کریں، اور اپنے لئے وہی یکساں قانون پسند کریں جو سارے ملک کے لئے نافذ ہو، وہ اپنے تمام تعلیمی مرکزوں کو جو انھوں نے اپنی پسند و ضرورت کے مطابق قائم کئے تھے، حکومت کی تحویل اور انتظام میں دے دیں، اور ان کے نظم و نسق سے خود دست بردار ہو جائیں، تا کہ ان سے ایک ہی طرح کے ماڈل تیار کئے جائیں جو اس سیکولر اور اشتمالیت پسند ملک سے ہم آہنگ ہو، حکومت اسلام کی مخالف نہیں، اور اس کو اسلام کے ختم کرنے کے کام سے کوئی دلچسپی نہیں، اس کو تو اس پر فخر ہے کہ عالم اسلام کی سب سے بڑی مسلم برادری یہاں آباد ہے، اس کو آباد رہنا، اور پھلنا پھولنا چاہیے، اس سے بڑے بڑے کام لئے جا سکتے ہیں، اور بین الاقوامی اور سیاسی موقعوں پر اس کو ایک دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، آج صاف صاف کہا جا رہا ہے کہ اگر مسلمانوں کو اس ملک میں رہنا ہے، تو ان کو قومی دھارے میں بہنا چاہیے، اور قومی دھارے کے معنی یہ ہیں کہ آپ تمام تشخصات سے دست بردار ہو جائیں، آج کا مطالبہ یہ ہے کہ مسلمان رہو، تمہیں کوئی نہیں ٹوکتا، یہ فرقہ وارانہ فسادات تو ایک مریض کی ہذیانی کیفیت، اور ہسٹریا کا ایک دورہ ہے، جو ہمیشہ نہیں رہے گا، آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ بہت کم ہو گئے ہیں، اور میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ وہ اور بھی کم ہو جائیں گے، میرے نزدیک یہ اصل خطرہ نہیں، اصل خطرہ نسل کشی کا نہیں، معنوی ارتداد کا ہے، ذہنی و تہذیبی ارتداد، اس خطرہ کو دیکھنے اور اس کو محسوس کرنے کے لئے کسی بڑی فراست، اور دوربینی کی ضرورت نہیں، یہ تو دیوار کا نوشتہ ہے، جس کو ہر ایک پڑھ سکتا ہے، اللہ تعالٰی نے جن کو آنکھیں دی ہیں، وہ صاف دیکھ رہے ہیں کہ آج علی گڑھ کا معاملہ ہے، کل دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء کی باری آسکتی ہے، وقت اور حالات کا مسئلہ ہے، اور اس کا انحصار اس پر ہے کہ ہم علی گڑھ کے مسئلہ پر کتنی زندگی اور بیداری اور کتنی غیرت اور خودداری کا ثبوت دیتے ہیں۔

دینی بدعات اور منکرات سے برسرِ پیکار رہنے والوں کے اخلاف کی ذمہ داری

عزیز طلبہ! آپ کے اسلاف وہ تھے جنھوں نے بدعات کے ساتھ ادنیٰ مصالحت گوارہ نہیں کی، آپ کے اسلاف نے آج تک مولود کے قیام کی اجازت نہیں دی، کتنے رسوم اور طریقے ہیں، جو مسلمانوں کی زندگی میں داخل ہو گئے، اور انھوں نے مذہبی فرائض، اور دینی شعائر کی حیثیت اختیار کر لی ہے، لیکن آپ کا جس مکتبِ خیال اور مسلک سے تعلق ہے، اس کے علماء نے ان کی ہمیشہ مخالفت کی، اور ان کو بدعت اور بے اصل بتایا، اس کی ان کو معاشرتی اور اجتماعی زندگی میں بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی، ان کا مقاطعہ کیا گیا، ان کو مسجدوں سے نکالا گیا، ان پر کفر و ضلالت کے فتوے لگائے گئے، وہ بہت سے دنیوی مفادات، اور لذتوں سے محروم رہے، لیکن انھوں نے ان چیزوں کے ساتھ ذرا بھی رواداری نہیں برتی، اور کسی مداہنت اور مصلحت کوشی سے کام نہیں لیا، میرا خود اسی کیمپ سے تعلق ہے، جو شرک و بدعات کے مقابلہ میں سربکف رہا ہے، بلکہ میرا تعلق اس خاندان سے ہے، جو اس سلسلہ میں بہت آگے رہا ہے، اور جو شرک و بدعت کے معاملہ میں زیادہ ذکی الحس واقع ہوا ہے، میرا نسبی و روحانی اور ذہنی تعلق حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ سے ہے، جنھوں نے اس ملک میں احیاءِ توحید اور سنت کی دعوت کا علم بلند کیا، اور اس کے لئے جان کی بازی لگا دی اگر میری جرأت معاف کی جائے تو میں کہوں کہ آپ کے کیمپ میں بھی یہ خیال اور یہ دعوت و حمیت اسی کیمپ سے آئی ہے، اس لئے مجھے یہ پوری تاریخ عزیز ہے، میں اس پورے ورثہ کو سینہ سے بلکہ آنکھوں سے لگاتا ہوں، نہ اس پر شرمسار ہوں، اور نہ اس سے دست بردار، میری تمام تحریریں، میری حقیر کاوشیں، اور کوششیں سب اسی ورثہ کی حفاظت اس کی

تبلیغ واشاعت، اور اس کی بازیافت میں صرف ہوئی ہیں ؎

میں کہ مری نوا میں ہے آتشِ رفتہ کا سُراغ
میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

میرے کوتاہ قلم نے "دعوت وعزیمت" کی داستان تفصیل سے بیان کی ہے، اور اس موضوع پر ہزاروں صفحات سیاہ کئے ہیں، مجھ پر ان کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے بھی ذمہ داری ہے کہ میں آپ کا احتساب کروں۔

آپ ان اسلاف کے نام لیوا ہیں جنھوں نے دین میں ادنیٰ تحریف، اور مسلمانوں کے ادنیٰ انحراف کو برداشت نہیں کیا، آج معاملہ بدعات کا نہیں، آج معاملہ انگریزی تعلیم کا نہیں، آج معاملہ ایک طرف شرک جلی، اصنام پرستی، اور دیومالائی عقائد (میتھالوجی) کا ہے، آج معاملہ برہمنی تہذیب اور ہندو معاشرت کے قبول کرنے کا ہے، دوسری طرف آج معاملہ مکمل لادینیت اور کمیونزم کے قبول یا رد کرنے کا ہے، آج معاملہ ایک ایسی قوم کی حیثیت اختیار کرنے کا ہے جس کی ساری وفاداریاں و وابستگیاں اس خاک کے ساتھ ہوں، جن سے ہمارے ظاہری جسم کا خمیر اٹھا ہے، اسی کے لئے جینا اور مرنا ہو، آج کا چیلنج اور آج کا خطرہ پچھلے تمام چیلنجوں، اور خطرات سے زیادہ سنگین ہے، اور اس کے قبول کرنے کے لئے کہیں زیادہ جرأت کہیں زیادہ ایمان اور استقامت، اور کہیں زیادہ ایثار و قربانی کی ضرورت ہے۔

موجودہ انقلاب کی برق رفتاری وہمہ گیری

پہلے انقلاب بڑی سست رفتاری، اور آہستہ خرامی کے ساتھ آتا تھا، جیسا زمانہ تھا، ویسا ہی انقلاب بھی، وہ بیل گاڑیوں، ہاتھیوں اور اونٹوں، اور زیادہ سے زیادہ

تیز رفتار گھوڑوں کا زمانہ تھا، اس وقت انقلاب انھیں سواریوں کی رفتار سے آتا تھا، پھر ریل چلی، انقلاب ریل پر سفر کر کے آنے لگا، ہوائی جہاز چلے، انقلاب کی رفتار تیز ہوئی، اب انقلاب ایٹمی انرجی استعمال کرتا ہے، آواز سے زیادہ تیز جہازوں، اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ دم کے دم میں گھر گھر پہونچ جاتا ہے۔

جمہوریت و حکومت کے دائرہ کی وسعت

آج "سلطانیٔ جمہور" کا زمانہ ہے، ہمارے اوپر پارلیمنٹ کی حکومت ہے، اور اس کو آئین سازی کا پورا اختیار، پھر حکومت کا دائرہ پہلے کی طرح دفاع، امن قائم کرنے اور ٹیکس وصول کرنے تک محدود نہیں، وہ زندگی کے تمام شعبوں اور تعلیم و تربیت کے تمام ذرائع پر حاوی ہے، اور گھر اور باہر کی کوئی چیز اس کے دائرۂ اختیار سے خارج نہیں، رات پارلیمنٹ میں ایک قانون پاس ہو جاتا ہے، اور آج سارے ملک میں اس کا نفاذ، اس وقت ہم اور آپ یہاں جمع ہیں، ممکن ہے اس وقت پارلیمنٹ کا کوئی اجلاس ہو رہا ہو، وہاں ایک قانون بن جائے، اور ہماری زندگی میں کوئی اہم تبدیلی واقع ہو، آپ کو معلوم ہے کہ پرانی حکومتیں پرائیوٹ معاملات میں دخل نہیں دیتی تھیں، ذاتی ملکیتوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا، آزاد درسگاہوں سے ان کو کوئی سروکار نہیں تھا، آپ جسے پرسنل لا کہتے ہیں، یعنی شادی، بیاہ اور ترکے وغیرہ کا قانون، اس سے ان کو کوئی علاقہ نہیں تھا، تعلیم میں کسی خاص عقیدے، کسی خاص فکر و مقصد پر ان کو اصرار نہ تھا، اب دنیا بدل چکی ہے، آپ کو سمجھنا چاہئے کہ آپ کس جگہ بیٹھے ہیں، زمانہ کے انقلاب نے آپ کو اس جگہ پر اچانک لا کھڑا کیا ہے؟ آپ آج اس محدود ماحول میں بہت خوش ہیں، آج آپ کو ہر طرف نورانی شکلیں نظر آتی ہیں، آپ کے کانوں میں، قال اللہ اور قال الرسول کے سوا کوئی صدا نہیں پڑتی، یہ آپ کا دارالحدیث

ہے، وہ دار التفسیر، یہ مسجد کا روحانی ماحول ہے اور یہ مدرسہ کی علمی فضا لیکن کل جب آپ یہاں سے جائیں گے، اور کل سے میری مراد یہ نہیں کہ جب آپ فارغ التحصیل ہو کر جائیں گے، بلکہ جب آپ چھٹیوں میں اپنے گھر جائیں گے تو وہاں آپ کو بہت کچھ دنیا بدلی ہوئی نظر آئے گی، میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کی چھٹیوں تک اس ملک میں کیا تغیرات ہو جائیں گے، اگر آپ نے اپنے گرد وپیش کی دنیا کا جائزہ نہ لیا، تو آپ اس دنیا میں خود بیگانہ بن جائیں گے۔

اندرونی خطرہ

بڑے خطرے کی بات یہ ہے کہ خود مسلمانوں کے اندر ایک جماعت ایسی پیدا ہو گئی ہے، جو غیر مسلموں کے مقابلہ میں "مدعی سست گواہ چست" کی مصداق ہے، وہ اگر کوئی بات ادھ کٹی، اور دبی زبان سے کہتے ہیں، تو یہ اس کو ڈنکے کی چوٹ پر کہنے کے لئے تیار ہیں، وہ صاف صاف کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہاں کی مشترک تہذیب میں ضم ہو جانا چاہیئے، اور تمام امتیازات یہاں تک کہ عربی، اسلامی ناموں سے بھی چینی مسلمانوں کی طرح دست بردار ہو جانا چاہیئے، وہ صاف کہتے ہیں کہ اگر ہم کو ہندوستان میں رہنا ہے تو ہر اس چیز سے دست بردار ہونا پڑے گا، جس میں "من وتو" کی تمیز پیدا ہوتی ہے، اور جو مسجد و کلیسا میں امتیاز کرتی ہے، اس وقت جو ذہن ہندوستان کی قیادت کر رہا ہے، وہ ہر اس چیز سے بھڑکتا ہے، جو کسی قسم کا امتیاز، اور تشخص پیدا کرتی ہے۔

تعین و وضاحت اسلام کا امتیاز

لیکن ہمارے دین کے حدود متعین ہیں، ہمارے دین کے اس "اکال الامم" سرزمین میں اپنی یگانہ شکل وصورت کے ساتھ باقی رہنے کا راز اسی میں مضمر ہے کہ اس میں آریائی مذاہب

کی طرح اطلاقیت، یا تعینات سے گریز، اور رقت وسیالیت نہیں ہے جس نے ہمہ اوست کے عقیدہ یا وحدۃ ادیان کے فلسفہ کو جنم دیا، ہمارے یہاں کفر وایمان، شرک وتوحید، ضلالت و ہدایت اور حلال وحرام کے درمیان واضح طریقہ پر خط کھینچا ہوا ہے۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ	تو جو شخص سرکش سے اعتقاد نہ رکھے اور خدا پر
بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى	ایمان لائے اس نے ایسی مضبوط رسی ہاتھ
لَا انْفِصَامَ لَهَا۔ (سورۃ البقرہ۔۲۵۶)	میں پکڑلی ہے، جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں ہے۔

وحدت ادیان نہیں، وحدت حق

وہ وحدت ادیان کا نہیں، بلکہ وحدت حق کا قائل ہے، یعنی سب دین ایک نہیں، بلکہ حق ایک ہے، وہ صاف اعلان کرتا ہے کہ:۔

فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ فَأَنّٰى	اور حق بات کے ظاہر ہونے کے بعد گمراہی کے
تُصْرَفُوْنَ۔ (سورہ یونس۔۳۲)	سوا ہے ہی کیا، تو تم کہاں پھرے جاتے ہو۔

اس کا ایک واضح اور معین نظام عقائد ہے، اس کی ایک مستقل تہذیب ہے، مکمل قانون، اور نظام معاشرت ہے، اس کے لئے اس کے صحیفہ میں صاف اعلان موجود ہے کہ:۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ	آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور
عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ	اپنی نعمتیں تم پر پوری کردیں اور تمہارے
دِيْنًا ۝ (سورہ مائدہ۔۳)	لئے اسلام کو دین پسند کیا۔

یہاں نہ کوئی اپنے آپ کو دھوکا دے سکتا ہے، نہ دوسرے کو، یہاں دن کی روشنی ہے، جس میں سپید وسیاہ صاف نظر آتے ہیں۔

دو حقیقت بیں آنکھیں

عزیزو! مولانا محمد قاسم صاحب بانیٔ دارالعلوم، اور مولانا محمد علی صاحب مونگیریؒ بانیٔ ندوۃ العلماء کو کس چیز نے تڑپایا؟ ایک کو یہاں اور دوسرے کو وہاں، میں ان دونوں میں کچھ فرق نہیں سمجھتا، میں ان کو ایک ہی چہرۂ زیبا کی دو آنکھوں کی طرح سمجھتا ہوں، دونوں روشن، دونوں پاکباز، اور حقیقت بیں، ایک ہی نور باطن اور ایک ہی فراستِ ایمانی دونوں میں کام کر رہی تھی، دونوں ہی "اتقوا فراسۃ المؤمن فانہ ینظر بنور اللّٰہ" کا مصداق تھے، دونوں تعلیمی مرکزوں میں نصاب ایک وسیلہ تھا، مقصد نہیں، اس کے اختلافات بنیادی حیثیت نہیں رکھتے، مولانا محمد علی مونگیریؒ اور ان کے رفقاء کی تحریریں پڑھئے، ان کی نگاہ ان جزئیات سے بہت بلند تھی، اگر کوئی یہ سمجھے کہ انھوں نے عربی ادب کو غالب کرنے کے لئے یا تاریخ اسلام اور علوم عصریہ کو جگہ دینے کے لئے ندوۃ العلماء کی تحریک شروع کی تھی، تو اس سے بڑھ کر کوئی حق تلفی ان کے ساتھ نہیں ہوسکتی، دونوں نے اپنے اپنے زمانہ کے فتنے کا مقابلہ کیا، ایک نے یہاں قلعہ تعمیر کیا، دوسرے نے وہاں، دونوں نے اپنے اپنے زمانہ کے چیلنج کو قبول کیا، اور بدلے ہوئے زمانہ کے مطابق دین کے محافظ، حق کے داعی اور شریعت کے ترجمان پیدا کرنے کی کوشش کی، خدا ان دونوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب سے سرفراز فرمائے، اور ان کے تمام رفقاء اور معاونین کو جزائے خیر دے اور ہمیں ان کے صحیح مقاصد کے سمجھنے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اصلاح و تجدید کی تاریخ میں افراد کا مقام اور کام

میرے عزیزو! اسلام میں تجدید و اصلاح کی پوری تاریخ، افراد کی اولوالعزمی کی

تاریخ ہے، کہنے کو یہ ملی اور اجتماعی تاریخ ہے، اور بیشک ہے لیکن عملاً یہ ازاول تا آخر افراد کی صلاحیتوں، ان کے عزم وہمت کی نمود ہے، جب کبھی اسلام کے لئے موت وحیات کی کوئی کشمکش پیش آئی، جب کسی طرف سے دین اسلام کو للکارا گیا، تو کوئی فرد کامل، کوئی صاحب عزم ہستی سامنے آگئی، ایسے موقع پر نہ کوئی کونسل بیٹھتی تھی، نہ کوئی مشورہ ہوتا تھا، کوئی صاحب یقین سامنے آجاتا تھا اور حالات کو یکسر بدل کر رکھ دیتا تھا حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ اور سیدنا حسن بصریؒ سے لے کر خاندان ولی اللٰہی اور ان دینی مرکزوں کے بانیوں، اور موجودہ دینی دعوتوں اور کوششوں کے علمبرداروں تک سب کا معاملہ یہی ہے کہ ؎

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

مجدد صاحب اور شاہ ولی اللہ صاحب کا کارنامہ

اقبال نے حضرت مجدد الف ثانی کے متعلق بالکل صحیح کہا تھا کہ ؎

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

انھیں کی کوششیں تھیں کہ ہندوستان کا رشتہ دین حجازی، اور محمد عربی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کٹنے نہیں پایا، اور وہ تہذیبی لحاظ سے برہمنیت، اور فکری واعتقادی لحاظ سے ویدانت کے آغوش میں جانے کے بجائے اسلام وشریعت محمدیؐ کی تحویل اور امانت میں رہا انھیں کا مخفی ہاتھ تھا جس نے اکبر کے تخت پر بالآخر محی الدین اورنگزیب جیسے غیور اور فقیہ بادشاہ کو بٹھایا، پھر اس ملک میں تجدید واحیاء دین کا جو کچھ کام ہوا، وہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے خاندان کا

کارنامہ ہے، کیا دیوبند یا سہارنپور، کیا دہلی، کیا لکھنؤ، ہم سب انھیں کے خوانِ نعمت کے ریزہ چیں ہیں، دارالعلوم، مظاہر علوم، اور ندوہ اور کتاب و سنت کی تعلیم کی سب درسگاہیں[1]، اسی ایک چراغ سے روشن کئے ہوئے ہیں، ان سب کا سلسلہ نسب شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے اخلاف نامدار اور ان کے تلامذۂ باکمال پر ختم ہوتا ہے ؎

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

دیوبند کے طلبہ کی ذمہ داری

آپ اس مدرسہ میں تعلیم پارہے ہیں، اس مدرسہ کا آپ سے مطالبہ ہے کہ آپ اس نئے چیلنج کو قبول کریں، یہاں اگر کوئی آئے تو یہاں اس کو کوئی ہل چل نظر نہیں آئے گی، لیکن اس کی تہہ میں طوفان سوئے ہوئے ہیں، اب بھی اگر کوئی موج ایسی اٹھ سکتی ہے، جو الحاد اور بے دینی کے مرکزوں کو متزلزل کرسکتی ہے، تو اسی بحر الکاہل سے ؎

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موجِ تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہہ و بالا

نازک ترین دور

میں تاریخ کا ایک طالب علم ہوں، اور تاریخ میرا ایک پسندیدہ اور محبوب موضوع ہے، میرا ہندوستان کی تاریخ کا جتنا مطالعہ ہے، اس کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی ہزار سالہ

---

[1] مثلاً جماعت اہلحدیث کے مدارس جو بنارس، دربھنگہ، مئو وغیرہ میں قائم ہیں۔

تاریخ میں اس سے زیادہ نازک دور نہیں آیا، اس لئے کہ اس دور میں حالات کو بدلنے، قلب و دماغ کو متاثر کرنے، ارادوں کو فنا کرنے، جذبات کو ختم کرنے، اقدار کو تبدیل کرنے، اور نقطۂ نظر و طریقۂ فکر میں انقلاب لانے کے اتنے وسائل کسی دور میں نہیں تھے، پہلے جو دور گذرے ہیں، ان کے پاس کیا سامان تھا؟ کیا سیاست کی یہ شیرینی اور چاشنی تھی؟ جمہوریت اور مساوات کا یہ نعرہ تھا؟ اخبارات ورسائل، پریس، ریڈیو، اور ٹیلی ویژن کی یہ طاقت تھی؟ یہ عظیم دانش گاہیں جنادری یونیورسٹیاں اور کالج تھے؟ جلسے اور جلوس اور پروپیگنڈے کی یہ مہارت تھی؟

زمانہ کے ابوالفضل وفیضی

گذشتہ دور کا سب سے بڑا فتنہ، فتنۂ اکبری کہا جاتا ہے، کیا اس وقت اقتدار اعلیٰ کے پاس یہ علمی مراکز تھے؟ یہ لاکھوں کی تعداد میں شائع ہونے والے اخبارات تھے؟ یہ نئی ایجادات تھیں؟ جو مشرق کی بات کو دم کے دم مغرب تک پہونچا دیتی ہیں؟ بے شک اکبر کے پاس فیضی اور ابوالفضل جیسے ذہین اور باکمال لوگ تھے، میں ابوالفضل وفیضی کی ذہانت کا قائل ہی نہیں، بلکہ اس سے مرعوب ہوں، لیکن آج کتنے ابوالفضل اور فیضی موجود ہیں، اس وقت وہ تنہا تھے، آج ان کے کام کے لئے مستقل ادارے قائم ہیں، ابوالفضل، فیضی کے اندر کبھی دینی جذبہ انگڑائی لیتا ہوگا، چنانچہ فیضی ہی کے قلم سے "سواطع الالہام" جیسی حیرت انگیز تفسیر نکلی، لیکن آج کے ابوالفضل، فیضی کے اندر وہ انابت بھی نہیں جو اس دور کے لوگوں میں تھی، اسلام کے ساتھ وہ جذباتی وابستگی بھی نہیں، جو اس زمانہ کے روشن خیالوں، اور تجدّد پسندوں کے اندر تھی۔

الحاد و تشکیک کے نئے دروازے

دوستو! فلسفہ اور علم کلام آج اپنی بہت کچھ طاقت کھو چکا ہے، سائنس میں بھی اب

پڑھے لکھوں کو ملحد، متشکک، اور منکر خدا بنانے کی وہ طاقت نہیں ہے، جو انیسویں صدی کے اواخر، اور بیسویں صدی کے بالکل اوائل میں تھی، اب اس کو اس مقصد سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر اس کے بہت سے علمبرداروں کے تغیر حال کی وجہ سے دینی حقائق، اور خدا، اور عالم غیب کے وجود و ثبوت کے لئے نیا مواد، اور نئے دلائل پیدا ہو گئے ہیں، چنانچہ آج فلسفہ و سائنس سے وہ الحاد اور تشکک نہیں پیدا ہو رہا ہے جس نے انیسویں صدی کے علماء حق کو مضطرب اور بے قرار بنا دیا تھا، آج اس کے برخلاف سیاسیات و معاشیات اور تاریخ وادب سے الحاد و تشکیک کا کام لیا جا رہا ہے، علوم عمرانیہ (سوشیالوجی) اور انگریزی ادب کے ذریعہ مذہب بیزاری اور ذہنی انتشار پیدا کیا جاتا ہے، آپ کے لئے شاید ایک حیرت انگیز انکشاف ہوگا کہ آج بہت سی یونیورسٹیوں کے عربی و اردو کے شعبے الحاد و تشکیک کے مرکز بنے ہوئے ہیں، اور شاید بعض یونیورسٹیوں میں عربی اور مطالعۂ اسلامیات کا شعبہ دینی حیثیت سے سب سے زیادہ کمزور ہے۔

حقیقت پسندانہ جائزہ اور وسیع تیاری

ہم کو اس صورت حال کا وسیع النظری، وسیع القلبی اور حقیقت پسندی کے ساتھ جائزہ لینا چاہئے، اور دیکھنا چاہئے کہ ہم کو زندگی کے میدان میں اترنے اور اسلامی دعوت، اور شریعت اسلامی کی حفاظت کا مقدس فریضہ اپنے ذمہ لینے سے پہلے کیا کیا تیاریاں کرنی چاہئے، اور کن جدید اسلحہ سے مسلح، اور کن جدید طریقہائے جنگ سے واقف، اور ان میں ماہر ہونا چاہئے۔

آپ کے لئے تقدیر الٰہی نے اس زمانہ کا انتخاب کیا ہے، سب سے پہلے آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ آپ کس زمانہ کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، یہ بات قابل فکر بھی ہے، قابل تعریف بھی، ہمدردی کی مستحق

بھی ہے' اور مبارکباد کی بھی' مبارکباد کی اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا اہل سمجھا، اور اتنی جلیل القدر خدمت آپ کے سپرد کی آپ اس ذمہ داری کو قبول کیجئے، وقت کے اس خطرے اور زمانہ کی اس سنگینی کو سمجھئے اور اس کی دعا کیجئے، اور خدا سے توفیق مانگئے کہ جس طرح آپ کے اسلاف کرام نے اپنے زمانہ کے بدعات وتحریفات اور اپنے زمانہ کے فتنوں اور ضلالتوں کو قبول نہیں کیا، آپ اس وقت کی بدعات وتحریفات اس دور کے فتنوں اور ضلالتوں اور جاہلیتوں کو قبول نہ کریں۔

مذہب کا مغربی تصوّر اور اس کا فتنہ

آپ اس چیلنج کو قبول کریں جو مذہب کو ہر قسم کے اثر ورہنمائی سے' اور زندگی میں مداخلت کرنے سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیتا ہے' مذہب بیزار یورپ — اس مسلمہ اصول پر اعتقاد رکھتا ہے کہ مذہب ایک پرائیوٹ معاملہ ہے' جو ہر قسم کے آزاد نظام تعلیم' آزاد تعلیم گاہوں اور مکمل وہمہ گیر تہذیب کے نظریہ کا مخالف ہے' اور جس کے بعد ہندوستان کی صورت حال وہی ہو جائے گی جس کو اقبال نے نصف صدی پہلے کہہ دیا تھا ؎

ملا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت
نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

دیوبند کے فضلاء کتنے مؤثر اور کامیاب ہو سکتے ہیں

صرف دارالعلوم دیوبند کے فضلاء اگر عزم کر لیں' اور توفیق الٰہی ان کی دستگیری کرے تو اس صورت حال میں بہت کچھ تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں' ان کا جمہور وعوام سے جو ربط ہے' وہ کسی

دینی جماعت کا نہیں، ان کے سارے ہندوستان میں مدارس کا جن کو ہم مدارسِ عربیہ کہتے ہیں، جال بچھا ہوا ہے، اور اس درسگاہ کے علماء و فضلاء وہاں مسندِ درس پر متمکن، عام مسلمانوں میں "ذی اعتبار" اور مساجد و محلوں میں بااثر ہیں، لیکن اس کے لئے ایک ایسی قلندرانہ جرأت اور ایک ایسے مستانہ یقین کی ضرورت ہے جس کو دیکھ کر ترجمانِ حقیقت شاعر پکار اٹھے ؎

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

ذہن و کردار کی تعمیر

ان نئے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے آپ کو ذہنی طور پر بھی تیار ہونا پڑے گا اور علمی طور پر بھی اور اخلاقی و روحانی طور پر بھی، ایک طرف آپ کو جدید فتنوں اور فلسفوں کی حقیقت و ماہیت کا پس منظر، ان کے محرکات اور عوامل، اور ان کے ارتقاء کی تاریخ کا غائر نظر سے مطالعہ کرنا ہوگا کہ اپنے حریف اور مدمقابل کو پوری طرح پہچاننا، اس کی طاقت اور اس کے مقاصد سے واقف ہونا مقابلہ کے لئے شرطِ اولین ہے، دوسری طرف آپ کو اپنے اندر اتنی پختگی، اور صلابت اور اتنی خودداری اور خود شناسی پیدا کرنی ہوگی کہ کوئی آپ سے آپ کے ضمیر کا، آپ کے عقیدہ کا، اور آپ کی دینی حمیت کا سودا کرنے کا خواب بھی نہ دیکھ سکے، موجودہ نظامِ تعلیم اپنے فضلاء کو ایک کف جو پر بکنا، اور اپنے جوہر و ہنر کا نیلام کرنا سکھاتا ہے، مگر ہمارا نظامِ تعلیم اس کا قائل ہے کہ ؎

ہر دو عالم قیمتِ خود گفتہ،
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

موجودہ عہد کی عام ضمیر فروشی

یہ عام ضمیر فروشی اور دین فروشی کا دور ہے، بڑے بڑے فاضل اور صاحبِ قلم ہیں، جن کی ذہانت، اور جن کے مطالعہ کے سامنے ہماری کوئی حیثیت نہیں، لیکن ضمیر کے نام کی کوئی چیز ان کے یہاں پائی نہیں جاتی، ان کے دماغ کی جگہ پر دماغ ہے، اور دل کی جگہ پر بھی دماغ ہی ہے، بلکہ ان کے پہلو میں ایک دھڑکتے ہوئے دل کے بجائے ایک رواں دواں قلم رکھا ہوا ہے، جو سب کچھ لکھ سکتا ہے، جس کے یہاں آخرت کی جوابدہی، اور ضمیر کی ملامت اور سرزنش کا کوئی سوال نہیں، ان میں زمانہ کے ساتھ بدلنے، اور اس کے مطالبوں کی ترجمانی کرنے کی غیر محدود صلاحیت ہے۔

نئی قیادت کی ضرورت

آپ یہاں سے مدرس بن کر نکلیں، مبارک، آپ علمی متون کے شارح ہوں، مبارک، آپ واعظ و خطیب ہوں، مبارک، آپ کتابوں کے مصنف ہوں، مبارک، میں بھی اس کا گنہگار ہوں، لیکن اس وقت زمانہ کو اس سے زیادہ کسی اور چیز کی ضرورت ہے، اس وقت زمانہ کو ان مردانِ کار کی ضرورت ہے، جو اس نئے دور کو ایک نئی فکری قیادت، ایک نیا دینی اعتماد، ایک نئی روحانی و اخلاقی قوت عطا کر سکیں، اگر ایسا نہ ہوا تو ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بڑا خطرہ ہے، اور اس ملک کے لئے بھی، آج زمین ہمارے پاؤں تلے سے نکلتی جا رہی ہے، اور بالکل وہی صورت حال ہے، جس کی قرآن مجید نے اپنے معجزانہ الفاظ میں تصویر کھینچی ہے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا — اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم زمین کو اس کے

مِنْ أَطْرَافِهَا۔ (سورۃ الرعد-۴۱) کناروں سے گھٹائے چلے جاتے ہیں۔

وَضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ اور زمین باوجود (اتنی بڑی) فراخی کے تم پر

وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ (سورۃ التوبہ-۱۱۸) تنگ ہوگئی اور ان کی جانیں ان پر دوبھر ہوگئیں

آج ہم جس زمین پر کھڑے ہوئے ہیں، اور جس پر دینی و علمی مرکزوں کے قلعے تعمیر کر رہے ہیں، وہ کوئی پتھر کی چٹان یا سطح میدان نہیں ہے، وہ ریت کا ایک تودہ ہے جس کے ذروں کو ہواؤں کے طوفان اڑا رہے ہیں، اور جو برابر ہمارے نیچے سے کھسک رہی ہے، یہ وہی زمین ہے جس کو قرآن مجید نے "كَثِيبًا مَّهِيلًا" کہا ہے۔

حقیقت شناسی، اور خود شناسی

دوستو! قبل اس کے کہ زمانہ آپ کو سبق دے، زمانہ کے بے درد اور بے رحم حقائق آپ کی آنکھیں کھولیں، آپ خود آنکھ کھولنے اور روشنی حاصل کرنے کی کوشش کریں، گرد وپیش کی دنیا کا جائزہ لیں، اور دیکھیں کہ اچانک آپ کو انقلاب روزگار نے کہاں لا کر کھڑا کر دیا ہے، کہاں مولانا محمد قاسمؒ، مولانا محمد علیؒ مونگیری، اور مولانا شبلیؒ کا عہد، اور کہاں آج کا عہد ... آپ عزم کے ساتھ اس انداز پر اپنے ذہنوں کی تعمیر کریں، اور اساتذۂ کرام رہنمائی فرمائیں کہ جب آپ اس محدود دنیا سے نکلیں تو آپ اس وسیع دنیا کے (جس میں آپ کو زندگی گذارنا ہے) حقائق سے آنکھیں ملا سکیں، حالات سے پنجہ آزمائی کر سکیں۔

آپ کے اسی گروہ کے اندر ان بوسیدہ کپڑوں اور نحیف جسموں میں شیر خفتہ ہیں، آپ ہی کے اندر ایسے پاک نفس داعی، اور ایسے بے لوث مصلح ہیں، جن سے آپ بھی بے خبر ہیں، اور آپ کے اساتذہ بھی اور آپ کے دوست و رفیق بھی، میں انھیں خوابیدہ صلاحیتوں کو اپنی اس کمزور

اور ناتواں آواز سے دستک دے رہا ہوں، کاش کہ میری آواز ان دروازوں کے پار پہونچ جائے، اور سونے والوں میں بیداری پیدا ہو، اور آپ اپنی بے کراں صلاحیتوں سے واقف ہوں، اقبال نے ہلال عید کو مخاطب کرکے کہا تھا، میں آپ کو مخاطب کرکے کہتا ہوں ؎

برخود نظر کشا ز تہی دامنی مرنج

درسینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند

زمانہ جس زبان کو سمجھتا ہے وہ نفع اور زندگی کے استحقاق کی زبان ہے

یہ اہم تقریر ۲۷ محرم الحرام ۱۳۹۳ھ مطابق ۲ مارچ ۱۹۷۳ء دار الحدیث جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر میں کی گئی۔ جلسہ کی صدارت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی صاحبؒ نے فرمائی مولانا کی خدمت میں اس موقع پر جو سپاسنامہ پیش کیا گیا اس کے جواب میں مولانا نے یہ کلمات ارشاد فرمائے۔

زمانہ جس زبان کو سمجھتا ہے وہ نفع اور زندگی کے استحقاق کی زبان ہے

بعد حمد و صلوٰۃ:۔

حضرت امیر شریعت، اساتذۂ کرام، طلبائے عزیز! آج میری ایک دیرینہ آرزو پوری ہوئی کہ میں یہاں اس عزیز و محبوب سرزمین پر حاضر ہوا، میری یہ حاضری آپ کے لئے کسی نفع یا کسی خدمت کا ذریعہ ہے یا نہیں، اس میں بہت شبہ کی گنجائش ہے، اور یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ میں آپ کی کوئی خدمت انجام دے سکوں گا، اور ان توقعات کو پورا کر سکوں گا جن کا آپ نے اپنے اس مخلصانہ سپاس نامہ میں اظہار کیا ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ حاضری میرے لئے موجب سعادت اور باعث سرفرازی ہے، میں یہاں خادمانہ حاضر ہوا ہوں، عزیزانہ بھی، برادرانہ بھی، لیکن اس سے زیادہ خادمانہ، میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ بھی یہاں تشریف لاتے تو وہ بھی اس حاضری پر خوش ہوتے، اور جن کی خدمت میں وہ آتے ان کو بھی اس سے بڑی مسرت ہوتی۔

قدیم تعلق

جیسا کہ سپاسنامے میں کہا گیا ہے، میرا اس سلسلہ سے اور اس ذات گرامی سے (جس سے اس جگہ کا

انتساب ہے) بہت قدیم اور عمیق تعلق ہے، اور میں اس تعلق پر نازاں بھی ہوں، شکر گذار بھی اور اللہ تعالیٰ سے دعاگو بھی کہ اس کو باقی رکھے، میں یہاں بالکل محسوس نہیں کرتا کہ میں کسی نئی جگہ پر ہوں اور کچھ اجنبی طلبہ کو، کسی مدرسے کے طالب علموں کو خطاب کر رہا ہوں، میں بالکل یہ محسوس کرتا ہوں کہ اپنے خاندان کے افراد کو اپنے ہی خاندان کے نونہالوں اور عزیزوں کو خطاب کر رہا ہوں، اور غالباً حضرت مولانا منت اللہ صاحب امیر شریعت بھی یہی سمجھتے ہوں گے، اور یہی محسوس کرتے ہوں گے، اور انھوں نے مجھے بلا کر یہ تصور نہ کیا ہوگا کہ وہ کسی اجنبی کو دعوت دے رہے ہیں، بلکہ اپنے ہی ایک عزیز اور فرد خاندان کو اپنے بچوں سے اور اس چمن کے نونہالوں سے ملا رہے ہیں، اس لئے آپ سے مجھے نہ کسی قسم کی کوئی معذرت کرنی ہے نہ کوئی رسمی شکریہ ادا کرنا ہے، البتہ اس سپاس نامہ پر اتنا ضرور عرض کروں گا کہ یہ سپاس نامہ تو اس کو پیش کیا جاتا ہے جس سے کسی قسم کی بیگانگی ہو، یا وہ مہمان کی حیثیت رکھتا ہو، یہ تو میرا گھر ہے، میں یہاں گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے حاضر ہوا تھا، اور یہ آپ نے تکلف برتا، لیکن چونکہ یہ تکلف محبت پر مبنی ہے اور اس کا محرک بہت قابلِ قدر ہے، آپ حضرات نے اپنے تعلق کے اظہار کا یہی طریقہ سمجھا جو آج کل رائج ہے، اس لئے میں اس کی زیادہ شکایت نہیں کروں گا، البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اس کی ضرورت نہ تھی، اگر آپ نے خلوص کے ساتھ اس کو پیش کیا تو اس کو سر آنکھوں پر رکھتا ہوں، اور آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

کہنے کی باتیں بہت ہیں

میرے عزیزو! اس وقت آپ سے کہنے کی باتیں بہت ہیں، ہم آپ سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کی جتنی دینی درسگاہیں ہیں، خواہ وہ ہندوستان میں ہوں، خواہ وہ مصر و شام میں ہوں، خواہ وہ مراکش، الجزائر اور ٹیونس میں ہوں، سب کے طلبہ ایک ہی کشتی کے سوار ہیں،

یہ کشتی اس وقت ایک متلاطم سمندر میں ہے، اس کا گرداب بلا اور اس کا بھنور بہت سخت ہے، اس میں اس وقت طوفان آیا ہوا ہے، اور بڑے بڑے جہاز جو بڑے بڑے انتظامات سے مسلح ہیں، اور جن کے تحفظ کا پورا سامان کیا گیا ہے، اور جو سمندر کے رخ پر بہہ رہے ہیں، وہ بھی اس وقت تلاطم میں ہیں، وہ بھی اس وقت ایک خطرہ محسوس کرتے ہیں چہ جائیکہ ہم اور آپ جو دریا کے رخ کے بالکل خلاف اپنی کشتی کو لے جا رہے ہیں، اس لئے ہم کو آپ کو بہت سنجیدگی کے ساتھ اپنے مسئلہ پر غور کرنا چاہئے۔

دو فریق

اس میں ایک فریق تو وہ ہے، جو دینی مدارس کے مستقبل سے بالکل مایوس ہے، ان کی افادیت کا منکر ہے، اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس غرض کے لئے ہیں، اور یہ کیا خدمت انجام دیں گے، اور ان کا کوئی فائدہ بھی ہے یا نہیں، ان کے پاس بدلے ہوئے زمانہ کے لئے کوئی پیام ہے، یہ اپنے اندر کوئی افادیت رکھتے ہیں، ان کے اندر باقی رہنے کی بھی صلاحیت ہے۔؟

ایک فریق وہ ہے کہ جو بالکل خوابِ غفلت میں مدہوش ہے، وہ حقائق کو بالکل نہیں سوچتا، وہ یہ سمجھتا ہے کہ جیسے آج سے چار سو برس اور چھ سو برس پہلے کا زمانہ ہے، جامعہ نظامیہ بغداد کا زمانہ ہے، جامعہ نظامیہ نیشاپور کا زمانہ ہے، یا کم سے کم درس نظامی فرنگی محل کا زمانہ ہے، اس کو کسی تغیر و انقلاب کی خبر نہیں، یا اگر خبر ہے تو اس نے اپنے کو اس سے بالکل بے تعلق بنا رکھا ہے، جیسا کہ آپ نے سنا ہوگا کہ شتر مرغ ریت میں اپنا سر دھنسا دیتا ہے، اور خارجی دنیا سے آنکھیں بند کر لیتا ہے، اور پھر اس کو خبر نہیں ہوتی کہ کیا ہوتا ہے، جب وہ نہیں دیکھتا تو سمجھتا ہے کہ کچھ ہو ہی نہیں رہا ہے، یہ دونوں فریق دو سروں پر ہیں، دونوں دو مختلف انتہاؤں پر ہیں جیسے ہماری درسی زبان میں "علیٰ طرفی نقیض" کہتے ہیں، ان میں کوئی بھی حقیقت پسندی سے کام نہیں لے رہا ہے، اور کسی کی بھی راہ، اعتدال کی راہ نہیں ہے۔

زمانہ تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے

آپ سے کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں ہے، اور اس کے لئے کسی بڑے انکشاف اور کسی بڑی تحقیق کی ضرورت نہیں ہے کہ زمانہ بہت نازک ہے، اور زمانہ بہت تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے، بلکہ بدل چکا ہے، اور اس کے بعد بھی وہ ایک جگہ پر رُکا ہوا نہیں ہے، بلکہ بدلتا چلا جا رہا ہے، اس لئے ہمارے مدارس کے طلبہ کو ان دونوں فریقوں سے بالکل ہٹ کر ٹھنڈے دماغ سے اور بہت صبر و سکون اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے کہ ان کا مستقبل کیا ہے، اور وہ کیا خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

مذہب کوئی عجائب خانہ اور میوزیم نہیں

یہ میں آپ سے کہہ دوں، بڑی بڑی کتابیں آپ پڑھ سکتے ہیں، اور آپ نے پڑھی ہوں گی، اور اگر پڑھنے کا ابھی موقع نہیں ملا تو آپ آئندہ پڑھ سکتے ہیں، اس موضوع پر بڑی اچھی اچھی کتابیں ہیں، لوگوں نے علمی حیثیت سے اور تحقیقی طریقے پر اس پر بحث کی ہے کہ کسی نظام کو محض روایات پرستی، محض قوت مقابلہ اور محض اصرار اور انکار کے ساتھ باقی نہیں رکھا جا سکتا، کوئی صالح سے صالح نظام ہو، اس کو محض روایت پرستی پر، اور ایک مقدس ورثہ کے طور پر یا آثار قدیمہ کے طور پر باقی نہیں رکھا جا سکتا، دنیا میں آثار قدیمہ کی گنجائش تو ضرور ہے، اور آپ نے بڑے بڑے شہروں میں آثار قدیمہ کے مرکز دیکھے ہوں گے، وہاں زندہ عجائب خانے بھی ہیں، اور مردہ عجائب گھر بھی ہیں، شاید آپ کے صوبہ کے دارالحکومت پٹنہ میں بھی کوئی ایسی جگہ ہو، ایسے آثار قدیمہ دنیا میں نہ صرف یہ کہ باقی رکھے جاتے ہیں، بلکہ ان کو سینے سے بھی لگایا جاتا ہے، اور ان کے لئے بہت بڑا قطعہ زمین مخصوص کر دیا جاتا ہے، اور ان کے لئے حکومت کے بجٹ کا ایک بہت بڑا حصّہ بھی مخصوص کر دیا جاتا ہے، یہ صحیح ہے،

لیکن اس کی حیثیت کیا ہے، اس کی حیثیت ایک بے ضرر، ایک غیر متعلق، ایک قابلِ زیارت، قابلِ دید، تفریح کے ایک سامان یا قدیم یادگاروں کے ایک مجموعہ کی ہے، اس سے زائد کچھ نہیں، ان کو اس لئے نہیں رکھا جاتا کہ زندگی میں ان کی ضرورت ہے، ان کے بغیر کام نہیں چلتا، وہ ایک بہت اہم خدمت انجام دے رہے ہیں، بالکل نہیں، بلکہ صرف اس لئے کہ اس مشغول زندگی میں کبھی کبھی تفریح کی ضرورت ہوتی ہے، تو ان سے تفریح حاصل ہوتی ہے، یا پھر قدیم تاریخ پر فخر کرنے کا ایک موقع ملتا ہے کہ قدیم عظمت کا وہ نشان ہے، کسی قوم، کسی ملک کے ایک دور کی تہذیب کا مرقع ہے، اگر آثار قدیمہ کے اندر احساس ہوتا یا جن کی طرف ان آثار قدیمہ کی نسبت ہے، وہ اگر زندہ ہوتے تو ہرگز اس صورت حال پر خوش نہ ہوتے۔

یہ پوزیشن کوئی زندہ اور صاحب دعوت قوم قبول نہیں کر سکتی

کوئی زندہ جماعت جو پیام رکھتی ہے، جس کا ایک مقام ہے، جس کو بعض حقیقتوں پر اصرار ہے، جس کو بعض چیزوں سے انکار ہے، جس کا اپنا ایک راستہ ہے، جس کو خدا نے روشنی عطا کی ہے، جو کچھ چیزوں کو غلط سمجھتی ہے، کچھ چیزوں کو صحیح سمجھتی ہے، وہ ہرگز اس پوزیشن کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کہ اس کے لئے کوئی جگہ مخصوص کر دی جائے، اور اس کو بے ضرر سمجھ کر وہاں رہنے کا موقع دیا جائے جیسا کہ فراعنۂ قدیم کی لاشیں ممی کی ہوئی مصر میں رکھی ہوئی ہیں۔

عربی مدارس آثارِ قدیمہ کے طور پر

جو لوگ عربی مدارس کی وکالت اور ان کی سفارش اس انداز سے کرتے ہیں کہ بھئی آپ کے یہاں بڑے بڑے میوزیم ہیں، آپ کے یہاں بڑے بڑے دار الآثار ہیں، برطانوی قوم کا حال یہ ہے کہ

اس کو سب سے زیادہ شغف میوزیم سے ہے، شاید جتنے بڑے بڑے میوزیم لندن میں ہوں، دنیا کے کسی شہر میں ہوں، اس لحاظ سے یہ عربی مدرسے آثارِ قدیمہ کی حیثیت سے باقی رکھے جائیں تو میں کم از کم ایسی پوزیشن کو ہرگز قبول کرنے پر تیار نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ جس نظام کی وکالت حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کی اور حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیریؒ نے کی جس کے لئے ندوۃ العلماء کی درسگاہ قائم ہوئی، ــــــــــ جس سے ہم سب لوگوں کو تعلق ہے، اس کی بنیاد ہرگز اس پر نہیں تھی، یہ رحم کی کوئی درخواست نہیں تھی، یہ رحم کے لئے کوئی استغاثہ نہیں تھا کہ صاحبو! بہت سی چیزیں آپ نے چھوڑ دی ہیں، قبرستان بھی باقی ہیں، بڑے بڑے آباد اور ایسے شہر ہیں کہ جہاں پر ایک گز زمین کا ملنا بھی مشکل ہے، وہاں پر بہت بڑے رقبہ میں قبرستان پڑے ہوئے ہیں، اور وہ ایک بہت بڑی جگہ گھیرے ہوئے ہیں، آپ کا کیا حرج ہے، اگر آپ ان مدرسوں کو بھی اسی طرح چھوڑ دیں، کم سے کم میں اس پوزیشن کو قبول کرنے کے لئے بالکل تیار نہیں ہوں۔

بہرحال ایک فریق تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ مدرسے اپنی افادیت اور اپنی زندگی کی صلاحیت ختم کر چکے ہیں، اور اب ان کو آثارِ قدیمہ کے طور پر باقی رکھنا چاہئے، تو میں آپ سے یہ کہہ رہا تھا کہ اول تو میں اس پوزیشن کو قبول نہیں کرتا، دوسرے یہ کہ دنیا میں جو اس مقام پر آجائے جو اپنے لئے یہ مقام پسند کرلے اس کے لئے پھر زندگی کی زیادہ گنجائش نہیں ہوتی، آج اگر ان قبرستانوں کو لوگوں نے کسی وجہ سے چھوڑ رکھا ہے تو کل ان کو نہیں چھوڑیں گے، چنانچہ آپ دیکھ لیجئے کہ دہلی میں حضرت خواجہ باقی باللہ کا قبرستان کتنا بڑا تھا، اس کے دیکھنے والے یہاں بھی موجود ہوں گے، میں بھی جب شروع میں دہلی جایا کرتا تھا، دہلی کی سیر کرتا تھا، تو ایک لق ودق میدان تھا، ہزاروں ہزار قبریں تھیں، اب ان کو تلاش کرتے رہئے، اب جہاں حضرت خواجہ کا مزار ہے، اس کے آس پاس کا تھوڑا سا حصہ باقی رہ گیا ہے، اس لئے کہ شہر کی ضروریات بڑھتی جاتی

ہیں، اور شہر کی ضرورت کو ایک حقیقت سمجھا جاتا ہے، اور یہ چیزیں محض ایک رعایت اور مجبوری کے دائرہ میں آتی ہیں، اور رعایت و مجبوری حقیقت کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اس لئے اول تو ان مدارس کی یہ پوزیشن صحیح نہیں، دوسری بات یہ کہ تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ ان چیزوں کو رواں دواں اور حقیقت پسند زندگی (وہ زندگی جو زندگی کی صلاحیتوں سے نہ صرف معمور بلکہ مخمور اور مدہوش ہے، اور جو کسی کو قبول کرنے یا اپنے حصہ میں سے حصہ دینے کے لئے تیار نہیں ہے) زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتی۔

محض مبنت فدا اور تاریخ کے سہارے پر کوئی ادارہ زندہ نہیں رہ سکتا

دنیا میں کوئی ادارہ محض اس وجہ سے نہیں چل سکتا کہ یہ ادارہ آج سے سو برس دو سو برس پہلے قائم ہوا، اور اس نے کچھ مفید خدمت انجام دی تھی، محض تاریخ کے بل پر، محض تاریخ کے سہارے کوئی ادارہ، کوئی تحریک، کوئی فلسفہ، کوئی نظام نہ چلا ہے، نہ چلے گا، اگر آپ کسی ادارے کو قائم رکھنے کے لئے اور اس کے لئے کچھ مراعات حاصل کرنے کے لئے اس کی تاریخ پیش کرتے ہیں کہ اس نے دور ماضی میں یہ خدمات انجام دیں، تو لوگ اس کو بالکل نہیں سنیں گے، اور اگر کوئی آج خاموش ہو جائے گا، تو کل اس کے اندر سے نہایت پر زور اور پر جوش تقاضہ پیدا ہوگا کہ اس کو ختم کر دینا چاہیے۔

بقاء انفع کا بے لاگ قانون

اللہ تعالیٰ کا جو نظام اس کائنات میں جاری و ساری ہے، جو ہمیں قرآن مجید اور تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، وہ بقائے انفع کا قانون ہے، یوں تو اس وقت دنیا نے

جس قانون کو تسلیم کیا، وہ بقائے اصلح کا قانون ہے (SURVIVAL OF THE FITTEST) لیکن حقیقت میں قرآن مجید سے جو سمجھ میں آتا ہے، وہ ہے "بقائے انفع" کا قانون، صاف صاف قرآن مجید میں ہے، سورۂ رعد کی آیت ہے آپ نے بہت پڑھی ہوگی اور اس کی تفسیر بھی دیکھی ہوگی "فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ"۔ جس چیز میں کوئی نافعیت نہیں، جس چیز میں کوئی پیام نہیں ہے، جو چیز کوئی اہم خدمت انجام نہیں دے رہی ہے جس پر انسان کی بقا، اور نشوونما اور انسان کی راحت اور ترقی کا کوئی انحصار نہیں ہے اس کو قرآن مجید نے "زبد" کے لفظ سے ادا کیا ہے، جو بہت ہی جامع اور نہایت وسیع اور عمیق لفظ ہے، اور معانی سے لبریز ہے "زبد" پھین کو کہتے ہیں یعنی دریا کا وہ جھاگ جو اپنے اندر کوئی ہستی نہیں رکھتا، جس کے اندر ثبات و استقامت کی کوئی صلاحیت نہیں، وہ دریا کے جوش کی ایک نمود ہے، دریا کے جوش کا ایک خارجی ظہور ہے اس کے اندر کوئی استقرار نہیں کوئی صلابت نہیں، بس ایک پھولی ہوئی سی چیز ہے، جس کے اندر ہوا بھر گئی ہے، یا یہ کہئے کہ نیچے کا جو میل کچیل تھا، وہ اوپر آگیا ہے، اس کے اندر انسانوں کو فائدہ پہنچانے کی کوئی صلاحیت نہیں ہے، وہ اوپر اوپر بہہ جائے گا، یا کنارہ پر جاکر کہیں کسی چیز سے اٹک جائے گا اور باقی نہیں رہے گا، اس لئے کہ اس میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا قانون اس کی اجازت نہیں دیتا کہ زبد زیادہ دنوں تک باقی رہے، اس لئے کہ یہ عالم اتنی وسعت نہیں رکھتا کہ اس میں زبد کی سمائی ہو، اگر دریاؤں کا جھاگ اور پانی کا پھین اس طرح باقی رہنے لگے تو جن کو باقی رہنا چاہیے، ان کے لئے مشکل ہو جائے "وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ" لیکن جو چیز لوگوں کو نفع پہنچانے والی ہے "فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ" وہ ٹھہر جاتی ہے۔

زمانہ جس زبان کو سمجھتا ہے وہ نفع اور زندگی کے استحقاق کی زبان ہے

اگر ہمارے مدارس یہ چاہتے ہیں کہ وہ باقی رہیں، اور وہ اس زندگی میں اپنی جگہ بنانا چاہتے ہیں، زندگی کا استحقاق ثابت کرنا چاہتے ہیں تو ان کو اپنے اندر نافعیت پیدا کرنی چاہیے، یعنی ان کو اپنے جوہر کا ثبوت دینا چاہیے، ان کو یہ ثابت کرنا چاہیے کہ زندگی کی کوئی ضرورت ہے، جو ان کے بغیر پوری نہیں ہوتی، اس لئے کہ زمانہ جس زبان کو سمجھتا ہے، اور ہر زمانہ میں سمجھتا رہا ہے، اس کے لئے ترجمہ کی ضرورت نہیں، وہ آپ عربی میں کہئے تو زمانہ سمجھے گا، انگریزی میں کہئے تو سمجھے گا، اور زبان بے زبانی میں کہئے تو سمجھے گا، گونگا اس کو کہے گا، اس کا اظہار کرے گا تو زمانہ سمجھے گا، اور اگر اپنے زمانہ کا کوئی سحبان اور کوئی لسان اس کا اظہار کرے گا تو زمانہ سمجھے گا، زمانہ جس زبان کو سمجھتا ہے، وہ نفع کی زبان ہے، وہ زندگی کے استحقاق کی زبان ہے، زندگی جیسا کہ اقبال نے کہا ہے "ایک جد و جہد ہے"، زندگی کوئی خیرات نہیں، زندگی تو خود حاصل کی جاتی ہے، آپ اس کا استحقاق پیدا کر لیجئے تو دنیا آپ کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوگی، جرمنی کو دو دو ہولناک جنگوں کے بعد بھی اس لئے باقی رکھا گیا ہے کہ اس نے اپنی صلاحیت کا ثبوت دیا، اس کو ہمیشہ کے لئے کوئی ختم نہیں کر سکا، بہت سی قومیں دنیا میں ہیں جو بالکل ختم ہو گئیں، لیکن بہت سی قومیں ایسی ہیں جو بار بار شکست کھانے کے بعد بھی باقی ہیں، مسلمانوں نے تاتاریوں سے شکست کھائی اور ایسی شکست کھائی کہ شاید دنیا کی کسی قوم نے ایسی شکست نہیں کھائی تھی، لیکن چونکہ ان کے اندر "مَا یَنْفَعُ النَّاسَ" کا مادہ تھا، وہ ایک پیام رکھتے تھے، وہ ایک زندہ دعوت رکھتے تھے اس لئے تاتاریوں کو ان کے سامنے جھکنا پڑا، وہ تاتاریوں کے سامنے جھکے، ان کی تلوار کے سامنے جھکے لیکن تاتاریوں کی تلواروں کو، دلوں کو، اور دماغوں کو ان کی نافعیت کے سامنے، اور ان کے پیام کے سامنے جھکنا پڑا۔

میرے عزیزو! آج ہمارے دینی مدارس کے لئے ایک ہی راستہ ہے، اور وہ یہ کہ وہ زندگی کا استحقاق ثابت کریں، اپنا امتیاز ثابت کریں، وہ یہ ثابت کریں کہ اگر وہ نہ رہے تو زندگی بے معنی ہو جائے گی، یا زندگی ناقص ہو جائے گی، اور کم سے کم اس میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہوگا، جس کو اور کوئی پُر نہیں کر سکتا، باقی رحم کی درخواست نہ کبھی دنیا میں سنی گئی ہے نہ کبھی سنی جا سکتی ہے، اور یہ زمانہ تو جمہوریت کا ہے، اس میں تو اب بالکل اس کی گنجائش نہیں رہی کہ ہم یہ کہیں کہ بھائی ہمیں فلاں حکومت نے باقی رکھا، فلاں حکومت نے باقی رکھا، ہم فلاں دور میں باقی رہے، فلاں دور میں باقی رہے، آپ بھی ہمیں باقی رکھئے، یا آپ یہ کہیں کہ ہم نے جنگ آزادی میں اتنا حصہ لیا تھا، ہمارا استحقاق ہے، اس کو اب دنیا ماننے کے لئے تیار نہیں ہے۔

آپ ایک اہم محاذ پر تعینات ہیں

آپ یہ ثابت کیجئے کہ آپ ایک ایسے مورچے اور زندگی کے ایک ایسے محاذ پر کھڑے ہوئے ہیں، کہ اگر آپ نے وہ محاذ چھوڑ دیا تو اس کو سنبھالنے والا کوئی نہیں، آپ ثابت کریں کہ آپ اخلاق کے محاذ پر کھڑے ہیں، آپ روحانیت کے محاذ پر کھڑے ہیں، خدمت خلق کے محاذ پر کھڑے ہیں، علمی بلندی کے محاذ پر کھڑے ہیں، علمی تحقیق کے محاذ پر کھڑے ہیں، آپ نے اگر اپنی جگہ چھوڑ دی یا آپ کو اپنے محاذ سے ہٹا دیا گیا، تو زندگی میں اتنا بڑا خلا پیدا ہوگا، جس کو نہ یونیورسٹیاں پُر کر سکیں گی، نہ علمی مجلسیں پُر کر سکیں گی، نہ کوئی اکیڈمی پُر کر سکے گی، اور نہ کوئی اور کوشش پُر کر سکے گی، یہ ہے خدا کا بنایا ہوا وہ ابدی قانون جس کو قرآن مجید کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ "فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ" پہلی بات تو یہ ہے کہ اب اس وقت ہمارے مدارس محض مسلمانوں کے جذبۂ خیر، مسلمانوں کی دین پسندی، اسلام پسندی یا

۱

محض مسلمانوں کے دین و شریعت کے احترام یا محض بعض علماء کی قربانی یا بعض علماء کی بزرگی کے بل پر قائم نہیں رہ سکتے، میں دل پر پتھر رکھ کر یہ الفاظ کہہ رہا ہوں اور خود مجھے اس سے تکلیف ہے، لیکن یہ حقیقت ہے، جس کا اظہار کم سے کم اس درسگاہ کے عزیز طلبہ کے سامنے ہو جانا چاہیے، جس کے بانی نے زمانہ کی نبض کو پہچانا، جس کے بانی نے سب سے پہلے اپنے دور میں یہ اعلان کیا کہ زمانہ بدل گیا ہے، زمانے کے جائز تغیرات کو واقعی تغیرات تسلیم کرنا چاہیے، اور اپنی افادیت ثابت کرنی چاہیے۔

حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کی فراست و بصیرت

حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیری رحمۃ اللہ علیہ جن کو آپ حضرات ایک شیخ طریقت کی حیثیت سے جانتے ہیں، بے شک وہ ایک بلند پایہ شیخ طریقت تھے، بہت اعلیٰ صاحب نسبت بزرگوں میں تھے، اور اس کی شہادت ان کے تمام معاصرین نے دی ہے، حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب رحمۃ اللہ کے الفاظ ان کے متعلق بہت بلند ہیں کہ اس کی بلندی تک ہماری رسائی ممکن نہیں، لیکن اس میں اضافہ کرتے ہوئے میں عرض کروں گا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ بصیرت عطا فرمائی تھی، وہ ادراکِ صحیح اور نور باطن عطا فرمایا تھا، جو بہت کم لوگوں کو ملا کرتا ہے، اور انھیں لوگوں کو ملتا ہے، جن سے اللہ تعالیٰ کوئی بڑا کام لیتا ہے، اقبال نے جو کہا ہے، میں ان کو بالکل اس کا مصداق سمجھتا ہوں ؎

دو صد دانا دریں محفل سخن گفت   سخن نازک تر از برگ سمن گفت

ولے با من بگو آں دیدہ ور کیست   کہ خارے دید و احوال چمن گفت

انھوں نے اپنے زمانہ کا خار دیکھا اور چمن کی اور فصلِ بہار کی داستان سنائی۔

ندوۃ العلماء کی تحریک دینی بصیرت کا نقطۂ عروج ہے

یہ ندوۃ العلماء کی تحریک معمولی تحریک نہیں ہے، یہ اس زمانہ کی دینی بصیرت کا نقطۂ عروج ہے، میں آپ کو حضرت مولانا محمد علی کی درسگاہ کا طالب علم سمجھ کر خطاب کر رہا ہوں، میں جامعہ رحمانیہ اور ندوۃ العلماء کو کم جانتا ہوں، میں تو حضرت مولانا محمد علی کی درسگاہ کی حیثیت سے آپ کو بھی اور ندوہ کے طلبہ کو بھی خطاب کرتا ہوں، دو ہی تین دن پہلے میں نے وہاں کے طلبہ کو خطاب کیا، یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ آج میں آپ کو خطاب کرنے کی عزت حاصل کر رہا ہوں۔

کرنے کے دو کام

اب میں آپ سے یہ عرض کروں گا، اور میں نے اس میں حضرت امیر شریعت کے مشوروں سے بھی فائدہ اٹھایا ہے، اور انھوں نے مجھے توجہ دلائی ورنہ ممکن ہے کہ میری اس گذارش کا رُخ کچھ اور ہوتا، اب میں آپ سے آپ کی زبان اور آپ کے مطلب کی بات کہنا چاہتا ہوں، آپ دو طرح سے اپنی افادیت ثابت کر سکتے ہیں، اور اپنے وجود کو تسلیم کرا سکتے ہیں، اور زندگی کا استحقاق پیدا کر سکتے ہیں، ایک داخلی محاذ سے ایک خارجی محاذ سے، داخلی محاذ تو یہ ہے کہ آپ علم میں کمال پیدا کریں، یہ بات میں آپ کو ایک ایسے جہاں گرد آدمی کی حیثیت سے بتاتا ہوں جس کے متعلق سپاس نامے میں بھی اشارے ہیں، اور حضرت امیر شریعت نے بھی فرمایا، اس میں کوئی تعریف کی بات نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی کہ مجھے باہر جانے کا اتفاق بار بار ہوا، اور صرف باہر جانے کا اتفاق نہیں ہوا، بلکہ مجھے وہاں کی ان مجلسوں میں شرکت کا اتفاق ہوا جو تعلیمی مسائل پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوا کرتی ہیں، اور بعض اداروں سے میرا مستقل تعلق ہے، یہ میں نے اس لئے کہا کہ آپ اس

گذارش کی قدر و قیمت سمجھیں، یہ کسی "عابر سبیل" رستہ گذرنے والے آدمی کی بات نہیں، یہ اس شخص کی بات ہے، جو ان مجلسوں میں بیٹھا ہے۔

"میرے دیکھے ہوئے ہیں مشرق و مغرب کے میخانے"

میں نے مشرق و مغرب کے میخانے دیکھے ہیں، اس لئے آپ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ علم میں کمال پیدا کرنا خواہ وہ کوئی علم ہو آپ کے لئے مفید ہے، اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم عربی میں اور علوم دینیہ میں کمال پیدا کریں گے تو جنگل میں مورنا چا کس نے دیکھا؟ بھلا اس کمال کا قدر دان کون ہے، یہ آپ کی بے خبری کی بات ہے، میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہاں سے لے کر امریکہ تک، یورپ تک، میکگل تک، اور آکسفورڈ اور کیمبرج تک ہر جگہ اس علم کی قدر ہے بشرطیکہ آپ نے اس میں کوئی کمال حاصل کیا ہو، لیکن کمال کس کو کہتے ہیں، کمال شُدبُد کو نہیں کہتے، کمال "کان یکونُ" کو نہیں کہتے، کمال اس کو نہیں کہتے کہ آپ عربی کی عبارت پڑھ لیں اور سمجھ لیں، اس کا نام کسی نے بھی کمال نہیں رکھا، کمال وہ ہے جسے کہتے ہیں کہ "جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے" کمال وہ ہے جو اپنا اعتراف کرالے، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ زمانے کے انقلابات و تغیرات کی یہ سب داستانیں بالکل بے بنیاد ہیں، وہ لوگ آپ کو بالکل دھوکا دیتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ زمانہ بدل گیا ہے، آپ کہاں ہیں، کس چکر میں ہیں، آپ کہاں اپنا وقت کھو رہے ہیں، ارے بھائی کالج، یونیورسٹی میں پڑھا ہوتا، سائنس پڑھی ہوتی، انگریزی لٹریچر پڑھا ہوتا، آپ نے اکنامکس کا مطالعہ کیا ہوتا، فزکس کا مطالعہ کیا ہوتا، ٹیکنالوجی کی تعلیم حاصل کی ہوتی، یہ سب بلا فریب اور خام خیالی ہے اس کے سوا کچھ نہیں، کمال آپ کسی چیز میں پیدا کریں اور امتیاز حاصل کرلیں، پھر آپ کو کبھی یہ شکایت نہیں ہوگی کہ زمانہ ہم کو نہیں پوچھتا، ہماری کوئی جگہ نہیں ہے، آج جو کچھ بھی آپ ہماری دینی تعلیم کا انحطاط دیکھ رہے ہیں، وہ بے کمالی کی وجہ سے ہے۔

طبِ یونانی کو اس لئے زوال ہوا کہ باکمال لوگ ختم ہوگئے

میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں، شاید میں اور کوئی مثال دیتا تو اس کے سمجھنے میں دقّت ہوتی، یہ دیکھئے کہ ایک زمانہ میں سارے ہندوستان میں طب یونانی کا زور تھا، ہر ہر جگہ مطب کھلے ہوئے تھے، اور ہندو اور مسلمان، اور نیک و بد اور جاہل و عالم سب حکماء کے پاس جاتے تھے، اور ان کے مطب کا یہ حال تھا کہ بس ایک بھیڑ لگی رہتی تھی، کیا آپ کہتے ہیں کہ طب یونانی کو زوال اس لئے ہے کہ ڈاکٹری آگئی ہے، ہومیو پیتھک آگئی ہے، اور جدید میڈیسن آگئی ہے، میں بالکل نہیں مانتا، طب یونانی کو اس لئے زوال ہوا کہ اب اس طرح کے طبیب نہیں پیدا ہوتے، اب اس طرح کے ذہین اطباء، ذی استعداد اور مجتہدانہ ذہن کے طبیب نہیں ہیں، اگر آج وہ پیدا ہو جائیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان کے پاس ڈاکٹر جائیں، اس میں ذرا مبالغہ نہیں، آپ کے شہر کا سول سرجن جھک مار کرکے ان کے پاس جائے، جب اس کی تکلیف رفع نہیں ہوگی، تو کیا کرے گا، آپ ایک ایسا طبیب پیدا کر دیجئے، میں جالینوس اور بقراط کا نام نہیں لیتا، میں افسر الاطباء حکیم عبد العلی جھوائی ٹولہ اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں کا ذکر کرتا ہوں، حکیم محمود خاں کا ذکر کرتا ہوں، اگر ان کے پائے کا نہیں ان کے آدھے کمال کا بھی آدمی کوئی پیدا ہو جائے تو طب یونانی کے زوال وغیرہ کی ساری داستان ختم ہو جائے، اور معلوم ہو جائے کہ طب یونانی زندہ ہے، بات یہ ہے کہ پہلے درس نظامی پڑھ کر لوگ طب کی طرف متوجہ ہوتے تھے، جتنے بڑے بڑے علماء ہیں تقریباً سب طب پڑھتے تھے، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ، حضرت مولانا مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مجھے معلوم نہیں، لیکن اکثر علماء اس زمانہ میں طب پڑھتے

تھے، ان میں سے بعض پیشہ کے طور پر اس کو اختیار کر لیتے تھے، اور بعض اس سے اشتغال نہیں رکھتے تھے، وہ منطق و فلسفہ پڑھے ہوئے، اور اشارات طوسی وغیرہ پڑھے ہوئے حل کئے ہوئے، جب طب کی طرف جاتے تھے، ذہین خاندانوں کے افراد ہوتے تھے، محنت کرتے تھے تو ان کو ایک ایسا ملکہ حاصل ہو جاتا تھا کہ نبض پر ہاتھ رکھا اور اندر تک پہنچ گئے، اور ایک ایک رگ و ریشہ کو پہچان لیا۔

مدارس کا بھی یہی حال ہے

یہی ہمارے آپ کے درس کا حال ہے، آپ کسی علم میں کسی فن میں، اختصاص پیدا کر لیں، امتیاز پیدا کر لیں، دنیا آپ کا لوہا مانے گی، اور معاشی مسئلہ بھی حل ہو جائے گا، اور مدارس کا جو مسئلہ اس وقت ہمارے یہاں درپیش ہے، یہ سب ختم ہو جائے گا، یہ سب دراصل ہماری پست ہمتی، سست کوشی اور ہماری کام چوری کی عادت کا نتیجہ ہے کہ آج کوئی استعداد پیدا نہیں ہو رہی ہے، اس کا سب سے زیادہ تجربہ تو ہمارے مولانا منت اللہ صاحب کو ہوگا کہ وہ دیوبند میں دیکھتے رہتے ہیں، ندوہ میں دیکھتے رہتے ہیں، دونوں جگہ کے وہ اہم بنیادی رکن ہیں کہ کس طرح کے فضلاء نکل رہے ہیں، دورہ کا امتحان لینے کے لئے لوگ گئے، اور معلوم ہوا کہ عبارت صحیح نہیں پڑھ سکتے، پہلی حدیث "إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوىٰ" ہی کو غلط پڑھا اور ترجمہ بھی غلط کیا، اسی طرح کے فضلاء مسلسل ادھر کئی سال سے نکل رہے ہیں، میرے خیال میں کوئی بیس پچیس سال سے یہ انحطاط نمایاں طریقے پر شروع ہو گیا ہے، اور پھر یہ شکایت کرتے ہیں کہ ہمارا زمانہ نہیں رہا، ہمارے والدین نے ہماری عمر برباد کی، آج بھی ایسے لوگ ہیں کہ جنھوں نے کسی فن میں

امتیاز پیدا کرلیا، اور جہاں ہیں وہاں مرجع خلائق ہیں، اور ان کا اٹھنا بیٹھنا مشکل ہے اگر کسی نے کسی ایک صنعت میں بھی کوئی امتیاز پیدا کرلیا تو بس پھر اس کے لئے فقر وفاقہ اور پریشانی بھی ختم اور اگر ہوگی بھی تو وہ کسی اپنی کمزوری کی وجہ سے ہو تو ہو، میں ابھی مولانا کی مجلس میں کہہ رہا تھا کہ میں نے مظاہر العلوم میں اس مہینہ کے شروع میں غالباً وسط فروری میں تقریر کی تھی، اس میں میں نے کہا تھا کہ اگر تم کسی صاحبِ کمال کے بارے میں سنو یا تاریخ میں پڑھو کہ وہ ضائع ہوا یا اس کی قدر نہیں ہوئی تو یقین مانو کہ اس کے اندر کوئی کمزوری تھی، کوئی سنک تھی، مراق تھا، سخت غرور تھا، گالیاں دیتا تھا، مارنے کے لئے دوڑتا تھا، اور سونے پر آیا تو سوتا چلا جا رہا ہے، جاگنے پر آیا تو جاگتا چلا جا رہا ہے، ایسی کوئی اس کے اندر مراق کی بات تھی، اس وجہ سے لوگ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکے، ورنہ میں نہیں مانتا کہ کوئی صاحبِ کمال جس کے اندر توازن اور اعتدال ہو وہ ضائع ہوا ہو۔

اصل مسئلہ محنت کا ہے

میں آپ سے ایک بات اور بھی کہہ دوں حالانکہ میری زبان سے آپ اس کو سننے کے بالکل متوقع نہیں ہوں گے، آپ کو معلوم ہے کہ ہماری درسگاہ ندوۃ العلماء کی بنیاد ہی اصلاح نصاب پر ہے، حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیری رحمۃ اللہ علیہ جیسا قدیم نظامِ تعلیم کا ساختہ پرداختہ اور اس کا بہترین نمونہ، وہ اس کا داعی، اور ہم بھی اس کے داعی، اور مولانا منت اللہ صاحب بھی اس کے موید۔ لیکن میں آپ سے کہتا ہوں کہ زیادہ مسئلہ نصاب کا بھی نہیں، زیادہ مسئلہ محنت کا ہے، اور اساتذہ کے پڑھانے کا ہے، قدیم نصاب سے وہ لوگ تیار ہوئے جو آج جدید نصاب سے تیار نہیں ہوتے

ہیں، کیا بات ہے، حالانکہ یقینی بات ہے کہ قدیم نصاب سے جدید نصاب کی بعض چیزیں یقیناً بہتر ہیں، مثال کے طور پر جس زمانہ میں "نفحۃ الیمن" اور "مقامات حریری" پڑھائی جاتی تھی، اور نثر کی کوئی ڈھنگ کی کتاب نہ تھی، جس سے زبان وادب کا صحیح ذوق اور اظہار خیال کی صلاحیت پیدا ہو، اس وقت تو ایسے لوگ پیدا ہو گئے، جنھوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے، علامہ زبیدی پیدا ہوئے، مولانا غلام علی بلگرامی پیدا ہوئے، شیخ محسن بن یحییٰ ترہتی پیدا ہوئے، اور نواب صدیق حسن خاں پیدا ہوئے اور مولانا صدر الدین آزردہ پیدا ہوئے، اور اب جب کہ نثر کی اچھی اچھی کتابیں پڑھائی جا رہی ہیں، اور اس میں عربی زبان کے بہترین نمونے جمع کر دیئے گئے ہیں، آج ایسے لوگ نہیں پیدا ہو رہے ہیں، اگر نصاب اس کا ضامن ہوتا تو اب پیدا ہونا چاہیئے، اور ہمیں لوگوں کو دیکھ لیجئے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی ہمارے رفیق تھے، اور ہمارے بڑے دوستوں میں تھے، انھوں نے عربی لکھنے میں بڑا کمال پیدا کیا، اور انھوں نے پڑھا کیا تھا یہی حریری وغیرہ پڑھی تھی، میرے زمانہ میں بھی "مختارات" وغیرہ نہیں لکھی گئی تھی، اپنی طالب علمی کے زمانے میں میں نے بھی حریری پڑھی اور دوسری کتابیں پڑھیں، تو اس میں بہت کچھ انحصار اساتذہ کی محنت اور ذوق آفرینی اور طلبہ کی محنت اور جد وجہد پر ہے، نصاب معاون ہے، میں اب بھی نصاب کے تغیر کا داعی ہوں، لیکن تنہا اس پر انحصار نہیں۔

اصل بات

اصل میں شکایت تو یہ ہے کہ آپ حضرات نے محنت کرنی چھوڑ دی ہے، آپ حضرات

کے اندر ولولہ نہیں، مسابقت کا جذبہ نہیں، آپ حضرات کسی فن میں کامل ہونے اور درس کی قوت پیدا کرنے کو فخر کی چیز ہی نہیں سمجھتے، اور ہمارے اسلاف ایسے تھے کہ ان کو بادشاہی ملتی ہو تو مدرسی کی خاطر اس کو وہ قبول کرنے کو تیار نہ تھے، مدرس بننے میں وہ اتنا بڑا اعزاز سمجھتے تھے، کہ وزارت کو ٹھکرا دیں، اور بعض بعض ایسے حضرات تھے کہ ہیں وزیر اور درس دے رہے ہیں، لکھنؤ میں وزیر آصف الدولہ کے زمانہ میں سعادت علی خاں کے زمانہ میں، روز ان کے یہاں رات کو درس ہوا کرتا تھا، اور دن کو وزارت کا کام ہوا کرتا تھا، ایسی بہت سی آپ کو مثالیں ملیں گی، تفضل حسین خاں علامہ، ریاضی کے بہت بڑے عالم گذرے ہیں، یہ وزیر اودھ تھے، لیکن درس اس طرح دیتے تھے کہ گویا صرف مدرس ہیں، ایسی بہت سی مثالیں ہیں، لیکن اب ہمارے آپ کے اندر مدرس بننا وجہ افتخار نہیں رہا، بلکہ ہم اس سے شرماتے ہیں کہ ہم مدرس بن جائیں، تو ایک بات آپ سے یہ کہنا ہے کہ داخلی طور پر آپ استعداد درست کیجئے، محنت کیجئے، اور پتہ پانی کیجئے، اور دل ماریئے اور کسی فن میں کمال پیدا کیجئے۔

آج ہمارے مدارس میں اس وقت جو بہت بڑا مسئلہ ہے جس کو کرائسس (CRISIS) کہنا چاہیئے، وہ ہے مدرس کا مسئلہ، آج مدرس نہیں مل رہے ہیں، ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اتنی بڑی درسگاہ لئے بیٹھے ہیں، لیکن ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں دو تین مدرس بعض فنون کے مل جائیں وہ نہیں مل رہے ہیں، اور دیوبند کو اس وقت شیخ الحدیث نہیں مل رہا ہے، اب یہ بات آپ کے لئے ہمارے لئے راز کی نہیں رہی کہ دیوبند میں شیخ الحدیث کا مسئلہ مناسب طریقہ پر حل نہیں ہو سکا، آج مولانا منت اللہ صاحب اس کے رکن رکین ہیں، اور وہ خاص کمیٹی جس نے یہ فیصلہ کیا اس میں وہ شریک ہیں، لیکن وہ بھی مطمئن

نہیں ہیں، میں بھی مطمئن نہیں ہوں، کوئی مطمئن نہیں یعنی جو دارالعلوم کی روایت تھی، جو دارالعلوم کا معیار تھا اس کے مطابق ابھی مسئلہ حل طلب ہے، اس لئے میں کہتا ہوں، یہ کام آپ کریں، آپ بالکل نہ دیکھیں کہ آپ گوشے میں پڑے ہوئے ہیں، آپ دیوبند میں نہیں پڑھ رہے ہیں، آپ ندوہ میں نہیں پڑھ رہے ہیں، ان باتوں میں کچھ نہیں رکھا ہے، آپ یہاں کمال پیدا کیجئے، دیوبند آپ کا محتاج ہوگا، ندوہ آپ کا طالب ہوگا، میں آپ کو لکھے دیتا ہوں کہ آپ جس وقت کسی فن میں کمال پیدا کرلیں گے، دیوبند میں آپ کی جگہ محفوظ، ندوہ میں آپ کی جگہ محفوظ۔

دینی صلاحیت پیدا کیجئے

ایک بات تو آپ سے یہ کہنا ہے اور دوسری بات یہ اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے اندر دینی صلاحیت پیدا کیجئے، آپ کے اندر علمائے ربانی کے کچھ اوصاف ہوں، آپ کے اندر اس سیرت کی جھلک ہو جو ان بزرگوں میں تھی، حضرت مولانا محمد علی صاحب، ان کے معاصرین اور ان کے ساتھیوں میں تھی، کچھ استغناء ہو، کچھ توکل ہو، کچھ اللہ تبارک و تعالیٰ سے تعلق ہو، کچھ آپ کو عبادت میں ذوق آئے، عوام کی سطح سے آپ کی سطح بلند ہو، اب یہ دو چیزیں ہوئیں، فن میں کمال، اور تعلق مع اللہ، یعنی جو علمائے ربانی کا شعار تھا کہ ان کے دیکھنے سے خدا یاد آتا تھا، ان کے پاس بیٹھنے سے آخرت کی یاد تازہ ہوتی تھی، اور دل میں گداز اور ایک قسم کی حرارت پیدا ہوتی تھی، خدا کی محبت جوش مارتی تھی، کسی درجہ میں وہ بات پیدا ہو، یہ تو آپ کو داخلی طور پر کرنا ہے۔

خارج کے دو کام

خارجی طور پر میں دو باتیں آپ سے کہوں گا کہ یہ آپ کے کرنے کے کام ہیں، یہ میں اس لئے نہیں کہہ رہا ہوں کہ میں اس وقت ایک ایسی مجلس میں گفتگو کر رہا ہوں، جس میں امیر شریعت تشریف رکھتے ہیں، اور جہاں اس نظام سے وابستہ بہت سے لوگ ہیں، میں بالکل دیانۃً آپ سے عرض کر رہا ہوں "اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ" آپ نے جب میرا استقبال کیا ہے، مجھ پر اعتماد کیا ہے، تو مجھے کہنا چاہئے کہ ایک کرنے کا کام یہ ہے کہ آپ کم سے کم صوبہ بہار و اڑیسہ میں امارت کے نظام کو پھیلائیے، اور پورے صوبہ میں اس کا جال پھیلا دیجئے، کوئی گاؤں اور کوئی قصبہ اس سے خالی نہ ہو، یہ آپ کے اس صوبہ کے لئے اتنی بڑی نعمت ہے کہ مجھے اگر رشک آتا ہے، اہل بہار پر تو اسی پر آتا ہے، یہاں اور بہت سی رشک کے قابل چیزیں ہوں گی، میں ان کا انکار نہیں کرتا، لیکن مجھے سب سے زیادہ یہ رشک آتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ان کو اس نعمت سے نوازا ہے کہ یہاں ایک نظام شرعی قائم ہے، اور لوگ اس کی قدر نہیں سمجھ رہے ہیں، اور بہت سے لوگ اس نظام کو کمزور کرنے کی بھی کوشش کرتے رہتے ہیں، میں آج ریل پر کہہ رہا تھا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے بڑے سے بڑے آدمی سے قیامت میں سوال ہوگا کہ تم نے بغیر شرعی نظام کے زندگی گذاری، تمہارا کوئی نظام نہیں تھا، کتنی سخت حدیثیں آئی ہیں کہ بعض مرتبہ آدمی کانپ جاتا ہے، تو میں آپ سے صفائی کے ساتھ یہ کہتا ہوں، مولانا ہوتے یا نہ ہوتے میں آپ سے یہی کہتا کہ آپ کا پہلا فرض یہ ہے کہ یہاں سے نکلنے کے بعد آپ اس امارتِ شرعیہ کے کام کو وسیع اور مستحکم کریں، اور سارے صوبہ میں اس کی شاخیں بنائیں،

اڑیسہ کے حالات سے میں زیادہ واقف نہیں ہوں، لیکن کم سے کم بہار اور اڑیسہ کے بھی اگر طلبہ یہاں ہوں تو میں ان سے بھی کہتا ہوں کہ ان دونوں صوبوں کو اس نظام کے دامن میں لانے کی کوشش کریں، اور اس نظام سے ایسا مربوط کر دیں کہ پورے صوبہ میں زندگی بالکل شرعی طریقے پر گذرنے لگے، اور بلکہ بہت اچھا ہو تاکہ جو صدقات اور زکوٰۃ وغیرہ کا نظام ہے، مثلاً اموال ظاہرہ کی زکوٰۃ جمع کی جائے، اموال باطنہ کے متعلق نہیں کہتا، اور اگر اس کا موقع ہو تو آخر حضرت عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے پہلے وہ نظام بھی نافذ تھا، بہر حال یہ آپ کا پہلا کام ہے، میں اس کام پر کسی کام کو ترجیح نہیں دیتا، آپ نے اگر یہ کام کر لیا تو آپ نے نہ صرف اس مدرسہ اور جامعہ رحمانیہ کا حق نمک ادا کیا، اور اس کے ساتھ آپ نے وفاداری کی اور اس کے سپوت ثابت ہوئے بلکہ آپ نے اس وقت دینی مدارس کے فرزندوں میں ایک امتیازی مقام پیدا کیا۔

دوسری چیز دینی مکاتب کا قیام ہے، معاف کیجئے گا، میں اس وقت عربی مدارس کی افادیت کا اتنا قائل نہیں ہوں کہ قصبے قصبے میں ہوں اور ہر جگہ دورہ ہو، اور ہر جگہ بخاری شریف ضرور ختم ہو، لیکن ان مکاتب کی ضرورت زیادہ ہے، یعنی مسلمانوں کو دین کے مبادیات سے واقف کرانا، اردو کا تحفظ اور دینیات سے واقفیت اور حلال و حرام اور اس سے بڑھ کر کفر و ایمان اور توحید و شرک، ان کا امتیاز ان کو ہو جائے، ہم آپ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، اور تیزی کے ساتھ ہندوستان بدل رہا ہے، ہر چیز کو نیشنلائز کیا جا رہا ہے، یونیورسٹیوں کی باری آگئی، مسلم یونیورسٹی کی باری آگئی، کل مدارس کی باری آسکتی ہے، تو اس کے لئے مکاتب کا جال بچھا دیجئے، اور مساجد کو مسلمانوں

کی زندگی کا مرکز بنائیے، سب سے آخر میں انقلاب کے قدم جہاں پر پہونچیں گے، وہ مسجدیں ہیں، اس لئے آپ ایسی جگہ اپنے مرکز بنائیے، جہاں دیر میں انقلاب پہونچے یا وہاں تک انقلاب پہونچتے پہونچتے قیامت آجائے، ممکن ہے، موقع ہی نہ ملے تو آپ مساجد کو مرکز بنائیے، اور کثرت سے مکاتب قائم کیجئے، اور بالکل اس کی پرواہ نہ کیجئے کہ آپ نے مدرسہ میں یہ پڑھا تھا، وہ پڑھا تھا، اور وہ علوم اور معارف اور حقائق پڑھے تھے، اور اب یہاں بچوں کو پڑھا رہے ہیں، دیہاتیوں سے باتیں کر رہے ہیں، آپ نے علم ضائع کیا کبھی اس کا خیال نہ کیجئے، مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہے، اور اسلام کا تحفظ، یہ دو محاذ ہیں، یہاں رہتے ہوئے استعداد پیدا کرنا اپنے علم میں کمال پیدا کرنا، اچھے مدرس بنانا اور باہر امارت شرعیہ کا نظام اور مکاتب کا قیام، اگر آپ نے یہ دو چیزیں کرلیں تو آپ "وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ" کے مصداق ہوں گے، اور کوئی بے رحم اور بے درد ہاتھ، کوئی ظالم ہاتھ اور کوئی انقلاب و تغیر آپ کے نقش کو مٹا نہیں سکتا، اور آپ کو اپنی جگہ سے ہٹا نہیں سکتا، اور سچی بات ہے کہ آپ کے لئے کوئی انقلاب نہیں ہے، آپ کے لئے کوئی تغیر نہیں ہے، اس لئے کہ آپ نے اپنی نافعیت ثابت کردی، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس کے لئے خاص طور پر ضمانت ہے، جو دین کے ذریعہ دین کے راستہ میں اپنی نافعیت ثابت کردے، جب ہی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا " ان تهلك هذه العصابة لن تعبد" اے اللہ تیری عبادت کا انحصار ان پر ہے، تیری توحید کی منادی کا انحصار ان پر ہے، آپ بھی ثابت کر دیجئے کہ " اللهم ان تهلك هذه العصابة لن تعبد فی هذه الارض" کم سے کم یہیں ہندوستان کے متعلق کہہ دیجئے، پھر کوئی آپ کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔

بس بھائیو! اگر آپ نے میری یہ باتیں یاد رکھیں، ہو سکتا ہے اس میں آپ کوئی جوش و خروش نہ پائیں کوئی خطابت نہ پائیں، کوئی علمی تحقیق نہ پائیں، لیکن یہ آپ کے کام کی باتیں ہیں تو انشاء اللہ آج سے دس برس کے بعد معلوم ہوگا کہ آپ نے ایک بہت بڑا حصار قائم کر لیا، نہ صرف اپنے لئے بلکہ تمام مدارس کے لئے اور دینی دعوت اور اس کے کام کے لئے، اگر یہ نہیں ہے تو مجھے ان دینی مدارس کے بند ہونے کا بہت خطرہ ہے، لیکن اگر آپ نے اللہ تعالیٰ کے یہاں مدد کا استحقاق پیدا کر لیا، اور یہاں آپ نے زندہ رہنے کا استحقاق ثابت کر دیا تو انشاء اللہ پھر انقلاب کی کوئی دست برد آپ کو مٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

رحم کی اپیل پر کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی

اور اگر یہ نہیں تو محض تاریخ کے سہارے محض روایات کے سہارے اور محض رحم کے استغاثے کے بل پر نہ کوئی جماعت رہ سکتی ہے، نہ کوئی ادارہ رہ سکتا ہے، نہ کوئی تنظیم رہ سکتی ہے، اگر آپ کسی پیام کے منتظر ہوں تو میرا پیام آپ کے سامنے یہی ہے اگر آپ کسی درخواست کو سُن سکیں تو میری یہ آپ سے درخواست ہے، اگر آپ کسی مشورے کے طالب ہوں تو میرا آپ کو یہی مشورہ ہے، اس کے علاوہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی صلاحیتوں کو پروان چڑھائے، آپ بڑے خوش قسمت ہیں کہ ایک بڑی شخصیت کے ساتھ وابستہ ہیں، ایک مرکز کے ساتھ وابستہ ہیں، اور وہ مرکز ایسا ہے کہ علم سے بھی اس کا تعلق ہے، اور امارت سے بھی اس کا تعلق

ہے، پورے نظام سے اس کا تعلق ہے، ہندوستان کے موقر ترین مدارس سے اس کا تعلق ہے، میں دعا کرتا ہوں کہ آپ ان کے دامن تربیت میں پورے طور پر پرورش پائیں، ترقی کریں، اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھائیں، اور اپنے علم سے ملت کو، ملک کو اور مسلمانوں کو فائدہ پہنچائیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مدرسہ کیا ہے؟

یہ تقریر ۲۲؍شوال ۱۳۹۶ھ (۱۷؍اکتوبر ۱۹۷۶ء) کو جامعۂ ہدایت جے پور کے سنگِ بنیاد کے موقع پر کی گئی تھی، جسے اولاً خود جامعۂ ہدایت جے پور نے ایک رسالہ کی شکل میں شائع کیا تھا اب اسے افادۂ عام کی غرض سے خود مولانا مدظلہٗ کی نظر ثانی کے بعد شامل کتاب کیا جا رہا ہے۔ ناشر

مدرسہ کیا ہے؟

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ

"وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِن بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنشُرُ رَحْمَتَهُ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ"

راجستھان کا ایک یادگار دن

جناب صدر، حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب، مولانا عبدالحی فائز، سید فاروق حسن صاحب وزیر اوقاف، علمار کرام، معززین راجستھان و حاضرین مجلس!

میں آپ حضرات کی اس عزت افزائی کا شکرگزار بھی ہوں، اور اس سے محجوب اور شرمندہ بھی کہ آپنے اس بڑے اعزاز کے لئے میری حقیر ذات کا انتخاب کیا، میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ جب میں خطبۂ استقبالیہ میں اپنے متعلق بلند الفاظ سن رہا تھا، تو کس قدر پانی پانی ہو رہا تھا، ایاز قدر خود رابشناس، اگر آدمی اپنی حقیقت نہیں پہچانتا تو وہ کچھ بھی نہیں پہچانتا، میں اس لحاظ سے اس نوخیز و نومولود جامعہ کی خدمت انجام دینے کی ضرور اہلیت رکھتا ہوں کہ میں ایک طالب علم ہوں، میرا ایک علمی خاندان سے تعلق ہے، اس میں میں کسی تواضع اور خاکساری کی ضرورت نہیں سمجھتا، اس راجستھان کے ایک مردم خیز علاقہ سے بھی میرا قدیم تاریخی

تعلق رہا ہے، یہ چیزیں میرے لئے ضرور سفارش کرتی ہیں، لیکن جتنا بڑا اعزاز آپ نے مجھے عطا فرمایا ہے، وہ ایک بڑی قبا ہے، جو ایک حقیر جسم پر راست نہیں آتی اور جسم کی کوتاہ قامتی کا اعلان کرتی ہے، اور اس کے لئے باعث شرمندگی ہے لیکن۔ ع

بر کریماں کارہا دشوار نیست

میں اس سے زیادہ کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا کہ شاید یہ بھی کسی تصنع اور بے جا خاکساری پر محمول کیا جائے۔

خزاں رسیدہ انسانیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ

حضرات! میں نے ابھی جو آپ کے سامنے آیت پڑھی ہے، اس کا انتخاب میں نے قاری صاحب کی قرأت سے کیا ہے، اور اس نے میری بڑی رہنمائی کی ہے، اور قرآن مجید اسی طرح ہمیشہ رہنمائی اور مشکل کشائی کرتا رہا ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے "هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهُ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ" (الشوریٰ - ۲۸)

اللہ وہ ہے جو بارش کو نازل فرماتا ہے، حقیقت میں "غیث" کا ترجمہ "بارش" پورا ترجمہ نہیں ہے، غیث اس چیز کو کہتے ہیں، جو عین وقت پر مدد کرے، عین وقت پر مشکل کشائی کرے، فریادرسی کرے، دست گیری کرے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، کہ جس طرح کسی جاں بلب مریض کے حلق میں آب حیات کے کچھ قطرے ٹپکا دیئے جائیں، اس کو کوئی داروئے حیات مہیا کر دیا جائے، اسی طرح سے تپتی ہوئی، سلگتی ہوئی، جلتی ہوئی اور دم توڑتی ہوئی زمین پر اللہ تعالیٰ آب حیات کے قطرے برسایا کرتا ہے "هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا" وہ فریادرسی فرماتا ہے اور زندگی کا سامان مہیا کرتا ہے، انسانوں کے لئے اس کے بعد کہ وہ مایوس ہو چکے ہوتے ہیں،

ان کی آنکھیں آسمان سے لگی ہوتی ہیں، وہ بڑے ارمان اور حسرت کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھتے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پانی برسا کر سوکھی کھیتی کو ہرا کر دے "هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهُ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ" اور اپنی رحمت کا دامن پھیلا دیتا ہے، اور اپنی رحمت کی ہوائیں چلاتا ہے، اور وہ "الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ" ہے، یہاں پر جن صفات کا انتخاب کیا گیا ہے، وہ بھی بڑی معنی خیز ہیں، اللہ کے سب نام اچھے "وَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ" اللہ کی سب صفات اعلیٰ اور بالا و برتر ہیں "وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ" لیکن یہاں "الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ" کی صفات کا انتخاب اس لئے کیا گیا کہ اس مضمون سے اور اس انسانیت کی چارہ سازی اور مسیحائی سے اس کا خاص تعلق ہے۔

یہ انسانیت کس کی ہے؟ اللہ کی ہے! وہی اس کا والی و وارث ہے، کوئی اپنی کھیتی کو سوکھا نہیں دیکھ سکتا، کوئی یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی لگائی ہوئی کھیتی سوکھ جائے، وہ "الولی" ہے وہی اس کا مالک بھی ہے اور پیدا کرنے والا بھی "الحمید" ہے، وہ حمد کا مستحق ہے، جس کی شان حمید کی ہے جس کی صفت حمید کی ہے اس کی شان سے یہ بات بعید ہے کہ وہ اپنی پیدا کی ہوئی مخلوق کو اس طرح بے یار و مددگار چھوڑ دے۔

مرض اور مسیحائی کے درمیان اٹوٹ رشتہ

حضرات! پیاس اور سیرابی، ضرورت اور اس کی تکمیل، مرض اور اس کی مسیحائی کے درمیان ایک ایسا رشتہ ہے کہ جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا، یہ ازلی اور ابدی رشتہ ہے، جب تک پیاس ہے، سیرابی ضرور ہے، جب تک ضرورت ہے تکمیل ضرور ہے، جب تک مریض ہے، اس کے لئے دوا و علاج کا سامان ضرور ہے، اسی طریقہ سے صحرا اور علم، صحرا اور ہدایت، ریگستان اور ہدایت کے

درمیان بھی ایک ایسا مخفی، ایسا لطیف اور ایسا قدیم اور دائمی رشتہ ہے جس کی شہادت قرآن مجید سے بھی ملتی ہے، تاریخ انسانیت سے بھی ملتی ہے، اور انسانی تجربات سے بھی ملتی ہے، آپ اس وقت کو یاد کیجیے جب ساری دنیا پر خزاں کا دور دورہ تھا، جب انسانیت کی پوری کھیتی انبیاء علیہم السلام کی لگائی ہوئی کھیتی اور انبیاء علیہم السلام کی ہزاروں برس کی کوششوں پر پانی پھر رہا تھا، جب انسانیت کی یہ کھیتی سوکھ رہی تھی، جب انسانیت دم توڑ رہی تھی، اور دیکھنے والوں کو صاف نظر آرہا تھا، (اس کے لئے کسی خاص بصیرت کی بھی ضرورت نہیں تھی، معمولی بصارت بھی کافی تھی) کہ کوئی گھڑی ہے کہ ٹل رہی ہے، چند گھنٹوں، چند منٹوں میں، یہ انسانیت دم توڑ دے گی اور یہ اس کا دم واپسیں ہے۔

اس وقت دنیا میں بڑے لہلہاتے ہوئے ملک تھے، گل و گلزار شہر تھے، وہ ملک بھی تھے، جو ہزاروں برس سے تہذیب و تمدن کا مرکز چلے آرہے تھے، جہاں علم کی ہوائیں چلتی تھیں، جہاں علم کی عطر بیزی تھی، جہاں کی زمین سے علم اگلتا تھا، اور جہاں کا آسمان معلوم ہوتا ہے کہ علم برساتا تھا، لیکن سارے ممالک انسانیت کی چارہ سازی اور انسانیت کی مسیحائی سے قاصر ہی نہیں تھے، بلکہ باغی تھے، منکر تھے، بلکہ وہ انسانیت کے درد میں اضافہ کرنے والے تھے، آپ اگر اس وقت کی تاریخ پڑھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انسانیت جس سے فریاد کر رہی تھی، انسانیت جس کے خلاف مدعی بنی ہوئی تھی، انسانیت جس کی گریباں گیر تھی، یہ وہی بگڑا ہوا تمدن تھا، یہی منحرف علم تھا، یہ وہی شاطر عقل تھی، وہی چالاکی تھی، وہی دانشمندی تھی جس نے غلط رخ اختیار کرلیا تھا، جس نے تعمیر کے بجائے تخریب کا رخ اختیار کرلیا تھا، اس وقت یونان بھی تھا، ایران بھی تھا، اور ہمارا ملک ہندوستان بھی تھا، چھٹی صدی مسیحی یا ساتویں صدی مسیحی میں یہ ملک تہذیب و تمدن کا بڑا مرکز تھا، ان لوگوں کی طرف

انسانیت کی نگاہیں لگی ہوئی تھیں کہ ان کی طرف سے کوئی بادِ بہاری کا جھونکا آئے، ان کی طرف سے جاں نوازی، مسیحا نفسی کی کوئی کوشش ہوگی، یونان کی طرف آنکھیں لگی ہوئی تھیں، اس نے فلسفہ دیا، لیکن وہ انسانیت کے درد کا درماں نہ تھا، ہندوستان کی طرف نگاہیں لگی ہوئی تھیں، اس نے حساب اور علم ریاضی دیا، مگر یہ انسانیت کے مرض کی دوا نہ تھی، ایران کی طرف اس کی نظر لگی ہوئی تھی، اس نے سپہ گری اور شاعری دی، مگر یہ بھی انسانیت کے درد کی دوا نہ تھی۔

صحرا بہار کا پیغام دیتا ہے

اس وقت تقدیر الٰہی کا فیصلہ ہوا کہ صحرائے عرب سے اللہ کی رحمت کے وہ بادل اٹھے، اللہ کی رحمت کے دریا میں وہ جوش آئے اور وہاں سے وہ موج نور چلے جو ساری دنیا کو زندہ کر دے۔

صحرا کا انتخاب اللہ تعالیٰ نے صرف اس لئے نہیں کیا کہ وہ اس کا سب سے زیادہ محتاج تھا، اللہ تعالیٰ کو اپنی قدرت کا یہ تماشا دکھانا تھا کہ وہ صحرا جو پانی کے ایک قطرے کو ترستا ہے، ساری دنیا کو سیراب کر سکتا ہے، وہاں خدا نے کسی دانشمند اور فلسفی کو بھی پیدا نہیں کیا، صحرا کا بھی انتخاب کیا، اور صحرا کے نبی کا بھی انتخاب کیا، اس صحرا میں اور صحرا کے نبی میں بھی ایک لطیف رشتہ تھا، اور خاص مناسبت تھی، صحرا عرب کا اور نبی امی کا کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی کہ دنیا کے دانشور اس کی تاویل کر سکیں، اور کوئی علت معلول کا ایسا مخفی رشتہ تلاش کر سکیں اور اس کی ایسی تشریح کر سکیں کہ جس کو علم و فلسفہ قبول کر سکے آپ کہہ سکیں کہ ایک عالم نے دنیا کو علم دیا اور ایک گل و گلزار ملک نے دنیا کو بہار کا پیغام دیا۔

صحرا بہار کا پیغام دیتا ہے اور نبی امی وہ علم عطا کرتا ہے، جو علم ہی نہیں علم گر اور علما گر ہے، وہ علم تنہا علم نہیں تھا بلکہ وہ تعلیم بھی تھا، اس میں معلم بنانے کی بھی طاقت تھی، کسی ایک

شخص کو معلم نہیں پوری امت کو معلم بنانے کی اس میں صلاحیت تھی، صحراء عرب کا سا صحرا اور پیغمبر نبی امی جیسا پیغمبر اللہ تعالیٰ نے یہ دکھا دیا کہ ہماری قدرت اور ہماری کارسازی اسباب کی محتاج نہیں ہے، وہ بلا سبب اور ساری دنیا کے تجربات اور ساری دنیا کے قیاسات کے خلاف کام کر سکتی ہے، پھر کیا ہوا، اقبال سے بہتر الفاظ میں اس کو ادا نہیں کیا جا سکتا ؎

از دمِ سیراب آں اُمّی لقبؐ
لالہ رُست از ریگِ صحرائے عرب

اس امی لقب کے لب نوشیں سے آبِ حیات کا وہ قطرہ ٹپکا جس نے صحرائے عرب کے جگر کو پھاڑ کر وہ پھول کھلایا جس نے ساری دنیا کو معطر کر دیا۔

ہری ہوگئی ساری کھیتی خدا کی

حضرات! اللہ تعالیٰ اپنی یہ نشانی ہمیشہ دکھاتا رہا ہے، اور جب سے علم کے دنیا میں پھیلنے کا اور سیرابی کے عام ہونے کا یہ سلسلہ صحرا سے شروع ہوا، اس کے بعد سے صحرا اور گلزار کی کوئی قید نہیں رہی، نبی امی کا یہ معجزہ مختلف زمانوں میں، مختلف ملکوں میں، مختلف وقتوں، مختلف حالات میں برابر ظاہر ہوتا رہا، آپ اسی ہندوستان کو لے لیجئے، بلکہ اسی صحرائے راجستھان کو لیجئے، جس کو ہم پہلے راجپوتانہ کا صحرا یا ریگستان کہتے تھے، یہاں بھی جب مسلمان آئے تو انھوں نے علم کے دریا بہا دیئے ؎

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہوگئی ساری کھیتی خدا کی

انھوں نے صرف دہلی کو، صرف لاہور کو، ملتان کو یا صرف لکھنؤ اور جونپور ہی کو

شیراز کا ہمسر نہیں بنایا بلکہ ناگور اور اخیر دور میں آپ کے قریبی شہر ٹونک کو بھی انھوں نے علم کا ایک مرکز بنا دیا، آپ اپنے اس راجستھان کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں، ہماری تاریخی بے مائگی اور ہمارے علم کی کوتاہی ہوگی اگر ہم یہ سمجھیں کہ راجپوتانہ کا ہندوستان کی علمی تحریک اور ہندوستان کی علمی کوششوں کی تاریخ میں کوئی حصہ نہیں ہے، اس نے ایک قائدانہ کردار ادا کیا ہے، دورِ اول میں ناگور اور دورِ آخر میں ٹونک نے اپنے امتیاز کا سکہ بٹھا دیا، اپنے علماء کی ذہانت اور تبحر کا اور ان کے علمی شغف کا لوہا منوا لیا، ناگور کے متعلق مجھے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دربارِ اکبری کی زینت وہ فاضل نوجوان ہیں، جن کو دنیا ابوالفضل اور فیضی کے نام سے جانتی ہے، جو ملا مبارک ناگوری کے بیٹے تھے اگرچہ ہمیں ان کے خیالات سے پورا اتفاق نہیں اور ان کی تاریخ پر تاریخ ہی میں بہت سے پردے پڑے ہوئے ہیں، ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اب وہ خدا کے یہاں پہنچ گئے ہیں، لیکن جہاں تک ان کے تبحر علمی، ان کے علمی تفنن اور ان کی ذہانت کا تعلق ہے، جہاں تک فیضی کی شاعری اور ابوالفضل کے زورِ قلم اور تاریخ نویسی کا تعلق ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

آخری دور میں جب ٹونک میں ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست قائم ہوئی تو ہمارا قریب کا یہ شہر جس کو شاید راجستھان کے باہر بہت کم لوگ جانتے ہوں گے، وہ بھی بہت بڑا علمی مرکز بن گیا اور وہاں ایسے علماء پیدا ہوئے کہ جن سے فیض حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے لوگ آتے تھے، علامہ حیدر علیؒ ٹونکی اور پھر ان کے بعد مولانا حکیم برکات احمد صاحب کے علمی و تعلیمی فیوض و برکات ہندوستان اور ہندوستان کے حدود سے متجاوز ہیں، ان کے علاوہ ٹونک میں جو جید اور سر آمد روزگار علماء پیدا ہوئے اگر آپ ان کے حالات پڑھنا چاہتے ہیں تو اردو ہی میں نہیں بلکہ عربی کی کتابوں میں بھی ان کے حالات ملیں گے، جو اس وقت عالم اسلام کے تمام کتب خانوں میں موجود ہیں۔

آخری دور میں مولانا محمود حسن خاں صاحب ٹونکی کا نام لیتا ہوں جن کے ذکر سے ہمارا سر فخر سے اونچا ہو جاتا ہے، جیسا کہ میرے تعارف میں کہا گیا ہے کہ میں مشرق وسطیٰ کے عرب ملکوں سے قریبی تعلق رکھتا ہوں، اور میں وہاں آتا جاتا رہتا ہوں، وہاں کی علمی مجلسوں، اور وہاں کی جامعات کو بھی خطاب کرنے کا مجھے موقع ملا ہے، جب بھی مولانا محمود حسن خاں صاحب ٹونکی کے علمی امتیاز اور علمی کارنامہ کا ذکر کیا تو لوگوں کے چہرے پر ایک حیرت اور آنکھوں میں ایک تجسس کی کیفیت پیدا ہو گئی، ہندوستان کی سرزمین میں، وہ ٹونک کو نہیں جانتے وہ راجستھان کو بھی نہیں جانتے وہ ہندوستان کو جانتے ہیں (الھند) تحتی بر اعظم ہندوستان نے اتنا بڑا مصنف پیدا کیا جس نے بہت سے مصنفین کو زندہ کر دیا، مصنفین ہی نہیں بلکہ ان مصنفین کے کارناموں کو بھی زندہ کر دیا، معجم المصنفین کے نام سے انھوں نے ایک کتاب لکھی، جہاں تک میری تحقیق اور میری معلومات ہے، بیس ہزار صفحات میں وہ کتاب لکھی گئی، کیا کوئی یقین کر سکتا ہے کہ یہ تنہا ایک شخص کا کارنامہ ہے، میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ یورپ میں ایک اکیڈمی جو کام کیا کرتی ہے، ہمارے یہاں مسلمانوں میں ایک آدمی کام کرتا تھا، اس ایک آدمی نے ایک اکیڈمی کا کام کیا، معجم المصنفین نے صرف ہندوستان ہی کے مصنفین کو زندہ نہیں کیا بلکہ تمام عالم اسلام کے مصنفین کو جن کا زمانی رقبہ پہلی صدی ہجری سے لے کر چودھویں صدی ہجری تک اور جن کا مکانی رقبہ مکہ اور مدینہ سے لے کر انڈونیشیا، بدخشاں، ختن اور تاشقند تک ہے، ان کے حالات پر سے پردہ اٹھایا، افسوس ہے کہ اس کی چند ہی جلدیں شائع ہو سکیں لیکن پھر بھی اس کتاب کی کوئی نظیر نہیں ہے، یہ میں آپ سے اس راجستھان نہیں بلکہ اسی جے پور کی جہاں آج جامعہ ہدایت کا سنگ بنیاد رکھا جائے گا، اس سے چند میل کے فاصلہ پر جو ایک گمنام سا شہر ہے، میں اس کی ایک تنہا شخصیت کا کارنامہ بیان کر رہا ہوں۔

تو صحرا کا علم سے اور تصنیف سے اور تحقیق سے ایک خاص رشتہ ہے، اور یہ رشتہ جو

عرب کے اس نبی امی کے ذریعہ قائم ہوا ہے، یہ ہمیشہ قائم رہے گا۔

اور آج بھی آپ اس جنگل میں جو منگل دیکھ رہے ہیں، آج آپ کو جو اتنی صورتیں یہاں نظر آرہی ہیں، آج آپ کو اس اسٹیج پر جو معزز ین نظر آرہے ہیں، یہ بھی درحقیقت اسی نبی امی کا فیض ہے، قیامت تک جو کچھ ہوگا، اسی کے طفیل ہوگا، اس نے جو علم کی شمع روشن کی تھی ؎

یک چراغیست دریں بزم کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

جہاں بھی آپ کو کوئی علم کی شمع جلتی نظر آئے گی اسی شمع اسی دیئے سے جلایا ہوا دیا ہوگا، یہاں جو شمع ہدایت آپ دیکھ رہے ہیں، اور جس جامعۂ ہدایت کے نام سے یہاں آپ جمع ہوئے ہیں، یہ اسی ہادی برحق اور اسی ہادیٔ کامل کی شمع ہدایت کا پرتو ہے جو آپ کو نظر آرہا ہے۔

علماء ہند کی علمی خدمات

حضرات! یہ جامعہ ہدایت کن بنیادوں پر قائم ہو رہا ہے؟ اس کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا کیا پیغام ہے؟ یہ کس ضرورت کی تکمیل کرے گا؟ یہ کس خلا کو پُر کرے گا؟ اس کے متعلق میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مدرسہ ہے کیا چیز! مدرسہ کی کیا ضرورت ہے؟ مدرسہ کی معنویت اور اس کی قدر و قیمت کیا ہے؟ کیا ان بلند و بالا جامعات کی موجودگی میں جن کا ایک نمونہ یہاں آپ کو راجستھان یونیورسٹی کی شکل میں بھی نظر آئے گا، اور یہاں کالجوں کی شکل میں بھی نظر آئے گا، ان عصری جامعات کی موجودگی میں ایک جامعۂ ہدایت کی ضرورت ہے؟ ایک عربی مدرسہ کی ضرورت ہے؟ اس کے متعلق نہایت موزوں طریقہ پر مولانا عبدالحی صاحب فائز نے بتلایا، عربی زبان کی اہمیت بتلائی، عربی زبان کی اہمیت اب سب کو تسلیم ہے ایک زمانہ تھا کہ جب ندوۃ العلماء نے عربی زبان کی اہمیت کی آواز

بلند کی اور آج سے ۸۵ ۔ ۹۰ سال پہلے یہ کہا کہ عربی زبان ایک زندہ زبان ہے، اس کو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے سیکھنا چاہئے اور اہل زبان کی طرح اس میں کمال پیدا کرنا چاہئے، یہ آواز اس وقت اس طرح بلند کی گئی جیسے کوئی جنگل میں آواز لگائے اور اس کا کوئی سمجھنے والا نہ ہو، آج زمانہ نے سیاسی انقلابات نے ثابت کر دیا اور دنیا کی ترقی نے اس بات کو صحیح ثابت کر دیا اور عربی زبان کی اہمیت پر جو ان روشن ضمیر علمائے نے آج سے تقریباً ایک صدی پہلے سمجھی تھی، زمانہ نے مہر تصدیق ثبت کر دی، آج عربی زبان کے بغیر گاڑی نہیں چلتی، آج عربی زبان کسی کو آتی ہے، تو وہ ابن بطوطہ کی طرح دنیا کے ایک سرے سے دوسرے تک سفر کرتا چلا جائے تو عربی زبان سے کام لے سکتا ہے، آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ جب میں کالی کٹ گیا تو میں مجبور تھا کہ وہاں عربی زبان کے ذریعہ تبادلۂ خیال کروں، اردو وہ حضرات سمجھتے نہیں، اردو جس پر ہم کو آپ کو بڑا ناز ہے اور جس میں آپنے ایسا فصیح و بلیغ سپاس نامہ یا خطبۂ استقبالیہ سنایا، اردو کیرالہ کی حد تک بالکل نامانوس ہے، میں ہندوستان کا ایک شہری اپنے ہندوستانی بھائیوں سے اپنے اظہار مافی الضمیر کے لئے اپنے خیالات ان تک پہونچانے کے لئے اس پر مجبور تھا، کہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں سے انگریزی میں گفتگو کروں اور وہاں کے دیندار لوگوں اور مسلمانوں سے عربی میں گفتگو کروں۔

خود اس ملک میں عربی زبان کا سکہ چل رہا ہے، اور اس عربی زبان میں یہاں ہندوستان میں جو کچھ کام ہوا اس کے متعلق اس وقت کیا عرض کروں کہ اس وقت کا یہ موضوع نہیں ہے اس پر مستقل تصنیفات ہیں کہ ہندوستان نے عربی زبان کو مالا مال کر دیا اور بعض گوشے ایسے ہیں کہ جس پر تنہا ہندوستان کا کنٹری بیوشن (CONTRIBUTION) ہے، ہندوستانی مسلمانوں نے اس موضوع کو شروع بھی کیا اور ختم بھی کیا۔

میں مثال کے طور پر کہتا ہوں "علمی اصطلاحات" نہایت نازک مسئلہ ہے جس طریقہ سے کہ جہاز کا قطب نما یا جہاز کا درست کرنے والا آلہ ہوائی جہاز کا یا بحری جہاز کا ہوتا ہے کہ اس میں اگر سوئی

بال برابر بھی ہٹ جائے تو جہاز راستہ بھول جائے گا، غلط راستہ پر پڑ جائے گا، اس طرح علمی اصطلاحات کی نوک پلک اتنی نازک ہے کہ ان کی تشریح میں ذرا سی بھی غلطی ہو جائے تو پورا کا پورا فن آدمی کے لئے چیستان بن جائے گا، اس نازک موضوع پر دو بہترین کتابیں تیرہ سو برس ہیں دنیا میں لکھی گئی ہیں، وہ دو ہندوستانی عالموں کی ہیں، (۱) "کشاف اصطلاحات الفنون" مولانا محمد اعلیٰ تھانوی کی جو بارہویں صدی کے ایک عالم تھے (۲) "دستور العلماء" مولانا قاضی عبدالنبی احمد نگری کی جو غالباً گیارہویں صدی کے ایک عالم تھے، یہ دونوں کتابیں تنہا ہندوستانی عالموں کے قلم سے نکلی ہیں، اس طریقہ سے حدیث کے مفردات کی شرح میں سب سے مستند، سب سے وسیع اور سب سے بڑی کتاب جو جامع ہے تمام کتابوں کی وہ ایک ہندوستانی عالم فخر ہندوستان علامہ محمد طاہر پٹنی گجراتی کے قلم سے "مجمع بحار الانوار" کے نام سے نکلی ہے، جس کو سارا عرب جانتا ہے، اور اس موضوع پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، سب سے اس نے مستغنی کر دیا ہے، اور میں بڑے فخر اور شکر کے ساتھ آپ کے سامنے اس حقیقت کا اظہار کرتا ہوں کہ خدا نے ہندوستانی مسلمانوں کو جو سعودی عرب میں ڈیڑھ سو دو سو برس سے رہتے ہیں، لیکن ہندوستان سے انھوں نے اپنا رشتہ توڑا نہیں ہے، نہ ہندوستان کی زبان سے نہ ہندوستان کی تہذیب سے، خدا نے انھیں کو توفیق دی کہ پہلی بار خوبصورت عربی ٹائپ میں وہ اس کتاب کو شائع کریں، میرا اندازہ یہ ہے کہ ۵۰ ہزار سے ایک لاکھ کے درمیان رقم اس پر صرف ہوئی ہوگی، یہ آپ کے پٹنی تاجروں کا کارنامہ ہے کہ جن کا جدہ میں اور مکہ میں اور ریاض اور مدینہ میں بڑا تجارتی کاروبار ہے، اس کا سہرا خاص طور پر نورولی خاندان اور اس کے بزرگ الحاج عبدالقادر نورولی صاحب کے سر ہے۔

مدرسہ کس درد کی دوا ہے

میں اب آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ مدرسہ کس درد کی دوا ہے، یہ مدرسہ جو قائم ہو رہا ہے،

خدا اس پودے کو پروان چڑھائے اور اس کو ایک شاداب اور سایہ دار درخت بنائے جس کے نیچے نسلیں آرام پائیں، اور اس سے ہدایت حاصل کریں یہ جامعہ کس خلا کو پر کرتا ہے کس ضرورت کی تکمیل کرتا ہے۔

حضرات! صحیح دینی مدرسہ کے بارے میں میرا نقطہ نظر بہت سے بھائیوں سے اور ان پڑھے لکھے دوستوں سے مختلف ہے جو مدرسوں سے واقفیت کا دعویٰ رکھتے ہیں یا اس سے تعلقات رکھتے ہیں، میں مدرسہ کو پڑھنے پڑھانے اور پڑھا لکھا انسان بنانے کا کارخانہ نہیں سمجھتا، میں مدرسہ کی اس حیثیت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں، میں اس سطح پر آنے کو تیار نہیں ہوں کہ مدرسہ اسی طریقہ سے پڑھنا لکھنا سکھانے یا یوں کہنا چاہئے کہ پڑھنے لکھنے کا ہنر سکھانے کا ایک مرکز ہے، جیسے کہ دوسرے اسکول اور کالج ہیں، میں اس کو مدرسے کے لئے ازالہ حیثیت عرفی کے مرادف سمجھتا ہوں، یعنی اگر میں مدرسہ کا وکیل ہوں یا میں خود مدرسہ بن جاؤں تو میں اس پر ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ قائم کر سکتا ہوں اگر کوئی مدرسہ کو صرف اتنا حق دینے اور مدرسہ کو صرف اتنا ماننے کے لئے تیار ہے کہ صاحب! جیسے پڑھنے لکھنے کا ہنر سکھانے کے لئے بہت سے کارخانے ہیں، بہت سے مرکز ہیں، کوئی اسکول کہلاتے ہیں، کوئی کالج کہلاتے ہیں، ان کے مختلف معیار اور مختلف سطحیں ہیں، اسی طریقہ سے مدرسہ بھی عربی زبان یا عربی علوم و فنون، فقہ اور دینیات، تفسیر و حدیث سکھانے کا ایک مرکز یا ایک کارخانہ ہے، میں مدرسہ کو نائبین رسول و خلافت الٰہی کا فرض انجام دینے والے اور انسانیت کو ہدایت کا پیغام دینے والے اور انسانیت کو اپنا تحفظ و بقا کا راستہ دکھانے والے افراد پیدا کرنے والوں کا ایک مرکز سمجھتا ہوں، میں مدرسہ کو آدم گری اور مردم سازی کا ایک کارخانہ سمجھتا ہوں جس طرح فیکٹریاں ہوتی ہیں مختلف قسم کی، کوئی گن فیکٹری ہوتی ہے، کوئی موٹر فیکٹری ہوتی ہے کوئی کسی اور قسم کی مشین ڈھالتی ہے، ہیوی الیکٹرک کے سامان پیدا کرنے کے بہت سے کارخانے ہیں، ہم ان کی بہت قدر کرتے ہیں، ہم ان کی ملک میں ضرورت تسلیم کرتے ہیں ہم ان کی تحقیر نہیں کرتے لیکن چیزوں کے مختلف درجے ہوتے ہیں، مدرسہ اس طرح کے پڑھے لکھے آدمی پیدا کرنے کا مرکز نہیں، مدرسہ ایسے لوگوں کو پیدا کرنے کا مرکز ہے، جن کا ابھی آپ کے سامنے ذکر کیا گیا ہے، یہ الگ بات ہے کہ مدرسہ

ایسا کر رہا ہے، یا نہیں اور ہر مدرسہ یہ کرنا چاہتا ہے یا نہیں؟ اس کا اس اصولی بحث سے کوئی تعلق نہیں، میں مدرسہ کے ایک خادم کی حیثیت سے اور مختلف مدارس سے تعلق رکھنے والے کی حیثیت سے اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ بہت سے مدارس یہ فرض انجام دینے سے قاصر ہیں یا قاصر ہو گئے ہیں، پہلے یہ فرض انجام دیا کرتے تھے، اب یہ فرض وہ انجام نہیں دے رہے ہیں کیوں؟ لیکن مدرسہ کو کیا فرض انجام دینا چاہیے، مدرسہ کا فرض کیا ہے؟ مدرسہ کے سپرد کون سا کام کیا گیا ہے؟

مدرسہ کا شجرۂ نسب

حقیقی مدرسہ کی بنیاد اور پہلے مدرسہ کی بنیاد کہاں رکھی گئی ہے؟ پہلے مدرسہ کی بنیاد قرطبہ اور غرناطہ میں نہیں رکھی گئی، قیروان اور قاہرہ میں نہیں رکھی گئی، دہلی اور لکھنؤ میں نہیں رکھی گئی، فرنگی محل، ندوۃ العلماء اور دار العلوم دیوبند میں نہیں رکھی گئی، پہلے مدرسہ کی بنیاد مسجد نبوی میں رکھی گئی، اور اس مدرسہ کا نام صفہ تھا آپ مجھے معاف کریں میں مدرسوں میں صحیح النسب مدرسہ اور عالی نسب مدرسہ اسی کو سمجھتا ہوں جس کا شجرۂ نسب صفۂ نبوی پر جا کر ختم ہوا اور میں اسی مسجد کو صحیح النسب مسجد سمجھتا ہوں جس کا شجرۂ نسب کعبۂ ابراہیمی پر جا کر ختم ہوا اور مسجد نبوی پر ختم ہو، میں اس کے مقابلہ میں دوسرے الفاظ بولنا نہیں چاہتا کہ وہ مسجد کیا کہلائے گی؟ لیکن قرآن مجید نے بتا دیا ہے، ہمیں اور آپ کو کوئی نیا لقب ایجاد کرنے کی ضرورت نہیں، وہ مسجد، مسجد ضرار کہلائے گی، جس کا شجرۂ نسب ابراہیم و محمد علیہما السلام کی بنائی ہوئی مسجدوں پر ختم نہیں ہوتا۔

اور وہ مدرسہ مدرسہ نہیں بلکہ انسانیت کی قتل گاہ کہلائے گا، جس کا شجرۂ نسب صفۂ نبوی پر ختم نہیں ہوتا، مسجد نبوی پر ختم نہیں ہوتا، اور ابوذرؓ و سلمانؓ پر ختم نہیں ہوتا، صدیقؓ و علیؓ پر ختم نہیں ہوتا زیدؓ اور سیدہ عائشہؓ پر ختم نہیں ہوتا۔

ان مبلغان دین، ان ہادیان انسانیت، ان پیشوایان عالم پر ختم نہیں ہوتا جنھوں نے ہدایت کا

پیغام دیا، جنھوں نے قربانی کا پیغام دیا، جنھوں نے خود نقصان اٹھا کر دوسروں کو نفع پہونچانے کا پیغام دیا کہ اپنا زیاں مقصود ہے اور اپنا زیاں گوارہ ہے، لیکن دوسروں کا زیاں گوارہ نہیں، جنھوں نے یہ پیغام دیا کہ اپنے گھر میں اندھیرا رکھ کر دوسروں کے گھروں میں روشنی کا انتظام کرو، اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر (اس لئے کہ ان کا سلسلہ انھیں پر ختم ہوتا ہے، جنھوں نے غزوۂ خندق میں پیٹ پر دو دو پتھر باندھے تھے) دوسروں کے بچوں کا پیٹ بھرنے اور ان کو کھلانے کا انتظام کرو، جنھوں نے یہ پیغام دیا کہ مدرسہ کا کام ملازمت دلانا نہیں ہے، مدرسہ کا کام آسامیاں بانٹنا نہیں ہے، مدرسہ کا کام ایسا پڑھا لکھا انسان بنانا جو اپنی چرب زبانی سے لوگوں کو مسحور کرے نہیں ہے، مدرسہ کا کام قرآن سنانا ہے، جب کہ دنیا میں ہر حقیقت کا انکار کیا جا رہا ہو اور یہ کہا جا رہا ہو کہ سوائے طاقت کے کوئی حقیقت ہے ہی نہیں، جب دنیا میں بلا محابہ ڈنکے کی چوٹ پر کہا جا رہا ہو کہ دنیا میں صرف ایک حقیقت زندہ ہے اور سب حقیقتیں مر چکیں، اخلاقیات مر چکے، صداقت مر چکی، عزت مر چکی، غیرت مر چکی، شرافت مر چکی، خودداری مر چکی، انسانیت مر چکی، صرف ایک حقیقت باقی ہے، اور وہ نفع اٹھانا اور اپنا کام نکالنا ہے، وہ ہر قیمت پر، عزت بیچ کر، شرافت بیچ کر، ضمیر بیچ کر، اصول بیچ کر، خودداری بیچ کر صرف چڑھتے سورج کا پجاری بننا ہے اس وقت مدرسہ اٹھتا ہے، اور اعلان کرتا ہے کہ انسانیت مری نہیں ہے اس وقت مدرسہ اعلان کرتا ہے کہ نقصان میں نفع ہے، ہار جانے میں جیت ہے بھوک میں وہ لذت ہے جو کھانے میں نہیں، اس وقت مدرسہ یہ اعلان کرتا ہے کہ ذلت بعض مرتبہ وہ عزت ہے، جو بڑی سے بڑی عزت میں نہیں، اس وقت مدرسہ اعلان کرتا ہے کہ سب سے بڑی طاقت خدا کی طاقت ہے، سب سے بڑی صداقت حق کی صداقت ہے، یہ ہے مدرسہ کا کام اور اگر مدرسہ یہ کام چھوڑ دے اور دنیا کے سارے کام کرنے لگے تو وہ مدرسہ، مدرسہ کہلانے کا مستحق نہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ جامعۂ ہدایت کا صحیح سنگِ بنیاد اسی پر رکھا جا رہا ہے، میرے گنہگار ہاتھوں سے نہیں رکھا جا رہا ہے، محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں سے رکھا جا رہا ہے، اور ان تمام

ہادیانِ انسانیت کے ہاتھوں سے رکھا جارہا ہے اور رکھا جا چکا ہے، یہ کوئی نیا واقعہ نہیں، یہ واقعہ سیکڑوں بار پیش آچکا ہے، اور دنیا کے چپہ چپہ پر جامعۂ ہدایت موجود ہے، جب تک یہ دین زندہ ہے، جب تک انسانیت کے اندر کوئی سانس اور رمق باقی ہے، اس کے اندر حقیقی انسانیت کی رمق باقی ہے، اس وقت تک دنیا کا کوئی گوشہ جامعۂ ہدایت سے خالی نہیں، یہ جامعۂ ہدایت درحقیقت ان حقیقی جامعاتِ ہدایت کے خاندان کا ایک فرد ہے، یہ کسی چیز کا آغاز نہیں، ایک تسلسل ہے، وہ تسلسل جو دنیا میں کسی بڑی سے بڑی چنگیزی، بڑی سے بڑی کسروی و قیصری، بڑی سے بڑی شہنشاہی اور زورِ شمشیر سے اس کی لائی ہوئی مصیبت کے زمانے میں بھی کبھی نہیں ٹوٹا، مدرسہ کا کام یہ ہے کہ وہ ایسے انسان پیدا کرے جو اس پست سطح سے بلند ہوں کہ قیمت لگائیے ہم سب کچھ بیچنے کو تیار ہیں، آج دنیا نیلام کی منڈی کے سوا کچھ نہیں، کہاں کا مدرسہ اور کہاں کا کتب خانہ کہاں کے اصول اور کہاں کے معیار، ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ دنیا ایک بازار ہے، اس میں ہر ایک اپنا جنس ہنر، اور اپنا جنس کمال ہاتھ پر رکھے ہوئے بیچنے کے لئے آیا ہے۔

لیکن ہم اس نقطۂ نظر کو تسلیم نہیں کرتے، ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ دنیا محض ایک بازار ہے، ایک منڈی ہے، یہاں جو آئے مال لے کر جائے اور بیچے، صرف مسئلہ قیمت کا ہے، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کو بیچنے میں کچھ دیر لگ جائے، اس لئے نہیں کہ اس کو اپنا جنس کمال اور اپنا جنس مذہب اور اپنا جنس اخلاق زیادہ عزیز ہے، بلکہ اس لئے کہ اس کے منہ مانگے دام نہیں مل رہے ہیں۔

جب انسانیت پر زوال آیا، جب اخلاقیات پر زوال آیا اور جب لوگوں کو یہ نظر آنے لگا کہ یہ جو حق و باطل کی بات کہی جاتی تھی، یہ محض زیبِ داستان کے لئے کہی گئی ہے اور اس کا کہیں وجود نہیں ہے، حق و باطل کوئی چیز نہیں ہے، حلال و حرام کوئی چیز نہیں ہے، کفر و ایمان کوئی چیز نہیں، غلط صحیح صواب و ناصواب کوئی چیز نہیں ہے، اصل چیز تو پیسہ ہے، اصل چیز تو طاقت ہے، اصل چیز عہدہ ہے،

اصل چیز مواقع ہیں، اس وقت مدرسہ نے ایسے لوگ پیدا کئے، کوئی ایسا آدمی لا کھڑا کردیا، ایسا بلند قامت انسان، ایسا کوہ پیکر انسان جس نے کہا کچھ نہیں، ہم نہیں جانتے، اور اگر کسی کو اعتبار نہیں آتا تو ہمیں خرید کر دیکھ لے، اگر وہ ہمیں خرید سکتا ہے تو ہم مان لیں گے کہ دنیا میں اخلاقیات کوئی چیز نہیں، اور ان سب پر مکمل زوال آچکا ہے، مدرسہ نے ہمیشہ ایسے لوگ پیدا کئے ہیں۔

میں آپ کو چند مثالیں دیتا ہوں کہ مدرسہ کیسے آدمی پیدا کرتا ہے، اس تھوڑے سے وقت میں جب کہ آپ کو اس تقریب میں بھی شرکت کرنا ہے، اور آپ دیر سے بیٹھے ہوئے ہیں، میں مدرسہ کی پوری کارگذاری آپ کو نہیں سنا سکتا، اس کو اگر آپ کو دیکھنا ہو تو مدرسوں کی تاریخ پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ایک ایک مدرسہ پر ضخیم ضخیم جلدیں لکھی گئی ہیں، میں مراکش گیا تھا، رباط گیا تھا تو کئی جلدوں میں مجھے جامعۃ القرویین کی تاریخ دی گئی، نہایت اعلیٰ درجہ کے آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی اور تصویروں سے مزین کئی ضخیم جلدوں میں صرف جامعۃ القرویین کی، ایسے ہی ازہر کی تاریخ آپ پڑھیں، ہمارے یہاں دارالعلوم دیوبند کی تاریخ آپ پڑھنا چاہیں، ندوۃ العلماء کی تاریخ آپ پڑھنا چاہیں، فرنگی محل کی تاریخ آپ پڑھنا چاہیں تو موجود ہیں، میں آپ کے سامنے چند مثالیں دیتا ہوں۔

یہ ہے مدرسہ کی شان

امام مالک کا زمانہ ہے، اور ساری دنیا میں علم کی دھوم مچی ہوئی ہے، اور بڑے فخر کی بات سمجھی جاتی ہے کوئی شخص یہ کہے کہ "حدثنا مالك بن انس، حدثنا مالك" یہ اس وقت کا سب سے بڑا اعزاز تھا کہ دنیا کے کسی گوشہ میں کوئی کہے "حدثنا مالك" سب کے کان کھڑے ہو جاتے تھے، اور سب سر اٹھا کر دیکھنے لگتے تھے کہ وہ کون سا خوش نصیب انسان ہے جس کو امام مالک سے تلمذ کا شرف حاصل ہے، یہ امام مالک آخری اموی اور ابتدائی عباسی خلافت کے زمانہ میں اپنی

مسند درس بچھائے بیٹھے تھے، مدینہ طیبہ کے محدود شہر میں، ان کے پاس پیام آتا ہے کہ آپ دربار میں زحمت فرمائیں، اور خلیفہ کے صاحبزادوں کو سبق پڑھادیں یعنی شہزادہ امین و مامون کو کچھ سبق پڑھادیں، انھوں نے فرمایا کہ آپ کے گھر سے اس علم کی توقیر وعزت کا سلسلہ شروع ہوا ہے آپ کے گھر سے لوگوں نے علم کی توقیر کا سبق سیکھا ہے اور آپ ہی کے ہاتھوں اس کی تذلیل ہو یہ آپ کے لئے مناسب نہیں ہے، علم کے پاس آیا جاتا ہے، علم کسی کے پاس نہیں جاتا، چنانچہ امین و مامون وہاں گئے اور انھوں نے امام مالک سے درس لیا، یہ ہے مدرسہ کی شان، یہ میں نے آپ کے سامنے ایک نمونہ رکھا۔

دوسرا نمونہ دیکھئے:۔

حضرت عطا، کا یا طاؤس کا واقعہ ہے کہ انھوں نے منصور کو ایک مرتبہ نصیحت کی، اور لوگ بھی وہاں مجلس میں بیٹھے تھے، وہ کہتے ہیں کہ ہم نے کپڑے سمیٹنے شروع کئے، اپنا دامن سمیٹنا شروع کیا کہ ابھی جلاد کو حکم ہوتا ہے، اور ان کا سر قلم کردیا جاتا ہے تو کم سے کم ان کے خونِ ناحق کے چھینٹے ہمارے دامن پر تو نہ پڑیں، وہ کہتے تھے، کہ ہم سب سہمے کھڑے ہوئے تھے کہ کیا حکم ہوتا ہے، منصور نے کہا کہ ذرا یہ قلم دوات رکھا ہوا ہے اٹھا دیجئے وہ ان کے قریب تھا، انھوں نے کہا میں نہیں اٹھا سکتا۔

"کیوں ــــــ؟"

انھوں نے کہا مجھے یہ اطمینان نہیں ہے کہ آپ اس سے کیا لکھیں گے، ممکن ہے کہ آپ خدا کو ناخوش کرنے والی چیز لکھیں، میں اس میں شریک ہونا نہیں چاہتا، وہ کہتے ہیں کہ پھر ہم نے اپنا دامن سمیٹا کہ اب حکم ہوتا ہے، جلاد کو، لیکن ہیبتِ حق کا یہ حال تھا کہ منصور نے کوئی حکم نہیں دیا، یہ میں نے آپ کو دوسرا واقعہ سنایا۔

اب میں تیسرا اور آخری واقعہ سناتا ہوں، اس سے آپ سمجھیں کہ علم کی کیا شان ہے، ایک بزرگ تھے، شیخ سعید حلبی، ابھی سو برس پہلے کا قصہ ہوگا، جو دمشق کی ایک مسجد میں بیٹھے ہوئے درس دے رہے تھے،

اتفاق سے اس دن ان کے پاؤں میں تکلیف تھی، اور وہ پاؤں پھیلائے ہوئے بیٹھے تھے، اور جیسا کہ قاعدہ ہے کہ استاذ پشت بہ قبلہ ہوتا ہے اور اس کے شاگرد سامنے بیٹھے ہوتے ہیں اور دروازے سے داخل ہوتے ہیں اور بیٹھ جاتے ہیں تو ان کا چہرہ دروازے کی طرف تھا اور پشت قبلہ کی طرف تھی اور پاؤں دروازے کی طرف پھیلائے ہوئے تھے اس وقت کا ایک مشہور بانی سلطنت مصر خدیوی سلطنت جو ابھی فاروق پر ختم ہوئی ہے ابھی پندرہ بیس برس پہلے تک وہ موجود تھی، محمد علی پاشا کا بیٹا تھا، ابراہیم پاشا وہ اس زمانہ میں بڑا سفاک اور جلاد مشہور تھا، وہ شام کا گورنر تھا اور اس کی سفاکی کے قصے لوگوں کی زبانوں پر تھے اس کو خیال ہوا کہ میں حضرت کا درس جاکر سنوں اور ملاقات کروں؟ راستہ ہی وہ تھا، اس لئے پہلے دروازے کی طرف سے آیا، سب کو خیال تھا کہ حضرت کو ہزار تکلیف ہو اس موقع پر اپنا پاؤں سمیٹ لیں گے اتنی دیر میں کیا ہو جائے گا، لیکن انھوں نے بالکل کوئی جنبش نہیں کی نہ درس موقوف کیا نہ پاؤں سمیٹا، اسی طرح پاؤں پھیلائے رہے، اور وہ پاؤں ہی کی طرف آکر کھڑا ہو گیا اب ان کے شاگرد کہتے ہیں کہ ہم بالکل لرزاں و ترساں تھے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے، کیا ہمارے شیخ کی شہادت ہماری آنکھوں کے سامنے ہو گی یا تذلیل ہو گی، مشکیں باندھ لی جائیں گی اور کہا جائے گا کہ چلو وہ کھڑا رہا اور وہ دیر تک درس دیتے رہے، التفات بھی نہیں کیا اور پاؤں بھی نہیں سمیٹا، مگر خدا جانے ان لوگوں کا کیا اثر ہوتا ہے کہ اس نے کچھ کہا نہیں کوئی سرزنش نہیں کی کوئی شکایت نہیں کی اور چلا گیا، سننے والی بات جو ہے وہ یہ کہ وہ کچھ ایسا معتقد ہوا کہ اس نے جاکر اشرفیوں کا ایک توڑا اعلام کے ہاتھ بھیجا اور کہا کہ شیخ کو میرا اسلام کہنا اور کہنا کہ یہ حقیر نذرانہ قبول فرمائیں آپ جانتے ہیں انھوں نے جواب میں کیا کہا؟ یہ آب زر سے لکھنے والا جملہ تھا جو علم کی تاریخ میں ہمیشہ روشن رہے گا، انھوں نے کہا اپنے بادشاہ کو سلام کہنا اور کہنا جو پاؤں پھیلاتا ہے وہ ہاتھ نہیں پھیلاتا، یا پاؤں ہی پھیلائے یا ہاتھ ہی پھیلائے ایک ہی کام ہو سکتا ہے، دنیا میں، جب میں نے پاؤں پھیلائے تھے میں اسی وقت سمجھتا تھا کہ

اب میں ہاتھ نہیں پھیلا سکتا "الذی یمد رجلہ لایمد یدہ" انہی الفاظ کے ساتھ مؤرخ نے ان کو نقل کیا ہے

"الذی یمد رجلہ لایمد یدہ"

جامعہ ہدایت کے طلباء اور فضلاء کو ہدایت

میرے دوستو اور بھائیو! ہمیں ایسے مدرسہ کی ضرورت ہے اور ہم توقع کرتے ہیں کہ جس مدرسہ کا نام ہی جامعہ ہدایت ہے، وہاں کے طلباء اور فضلاء کو اس سے یہ ہدایت ملے گی کہ وہ یہ غیرت اور خودداری سیکھیں، ان علماء ربانیین سے اور علماء حق سے جن کے واقعات سے تاریخ لبریز ہے، اس خودداری کا سبق سیکھیں کہ یا پاؤں پھیلالیں یا ہاتھ پھیلالیں۔

آج ہمیں ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے جو چاہے پاؤں نہ پھیلائیں، میں نہیں کہتا کہ پاؤں پھیلائیں، میں نہیں کہتا کہ آج زمانہ اس جرأت کا متحمل ہے، میں نہیں کہتا کہ اس زمانہ کی تہذیب اس کو گوارا کرے گی یا اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ بے ضرورت پاؤں پھیلائے جائیں، بے ضرورت پاؤں پھیلانے کی میں تبلیغ نہیں کرتا، مگر یہ ضرور کہوں گا کہ ہاتھ نہ پھیلائیں، عالم وہ ہے کہ جو ہاتھ نہ پھیلائے، آج ہمارے مدرسوں کو ان آدمیوں کے پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اور دنیا کو اور انسانیت کو ان عالموں کی ضرورت ہے جن کے متعلق تجربہ ہو جائے کہ یہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے والے نہیں ہیں، اور آج جس بزرگ اور گرامی ذات سے اس جامعہ کا انتساب کیا جا رہا ہے، انھوں نے ہمیں اسی کی تعلیم دی ہے، وہ ہاتھ پھیلانے والے نہیں تھے، اور ان کی روح جب ہی خوش ہوگی، جب اس جامعہ سے وہ لوگ نکلیں جو دنیا کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائیں، آج ہمیں یہ منظر نظر آ رہا ہے کہ سب نے کسی نہ کسی شکل میں ہاتھ پھیلا رکھا ہے، کسی کے ہاتھ پھیلے نہیں ہیں، اس لئے کہ ہاتھ پھیلانے کا ان کو موقع نہیں ملا، لیکن ہاتھ پھیلنے کے لئے تیار ہیں، مصیبت یہ ہے کہ جو ہاتھ پھیلے نہیں ہیں، وہ پھیلنے کے لئے بے چین و بے قرار ہیں، آج کون سا ہاتھ ہے جو

تڑپ نہیں رہا ہے کہ مجھے پھیلنے کا موقع ملے آج دنیا ذہینوں کو نہیں ترس رہی ہے فلسفیوں کو نہیں ترس رہی ہے۔ ع

میرے دیکھے ہوئے ہیں مشرق و مغرب کے میخانے

میں یورپ بھی دیکھ آیا ہوں اور مشرق وسطیٰ کا کونہ کونہ میں نے چھانا ہے آج بڑے بڑے عالموں کی، ادیبوں کی، مصنفوں کی، خطیبوں کی، شاعروں کی، دانشوروں کی، فلسفیوں کی کمی نہیں ہے آج کمی ہے، اُن اللہ کے بندوں کی، ان قدسی نفوس کی جو کسی شکل میں بھی ہاتھ پھیلانے کے لئے تیار نہیں، وہ موت کو ترجیح دیں گے لیکن ہاتھ نہ پھیلائیں گے، وہ اپنے ضمیر کا سودا کرنے کے لئے تیار نہیں۔

دنیا میں سیاسی انقلابات آئیں اور گذر جائیں، حکومتیں قائم ہوں، اور نکل جائیں، ہوا چلے اور بند ہو جائے، کچھ بھی ملک میں ہو لیکن ان کا ہاتھ کسی کے سامنے نہیں پھیل سکتا، وہ اپنے ضمیر کا سودا کرنے کے لئے تیار نہیں اور آپ یقین جانئے کہ یہ زمین و آسمان اس وقت تک صحیح طور پر قائم ہیں، جب تک کسی نہ کسی شکل میں تھوڑی سے تھوڑی تعداد میں خواہ ان کو دیکھنے کے لئے دوربین کی یا خوردبین کی ضرورت پیش آئے لیکن ان کا وجود تو ہو خوردبین بھی تو اسی کو دیکھ سکتی ہے جس کا وجود ہے جس کا سرے سے وجود ہی نہیں اس کو خوردبین کہاں سے دیکھے گی، آج اتنی چھوٹی شکل میں ایسی غیر مرئی شکل میں سہی ان لوگوں کا وجود کہیں تو ہوتا جن کو خوردبین سے دیکھا جا سکتا خدا کا شکر ہے ایسا تو نہیں ہوا کہ دنیا ان کے وجود سے یکسر خالی ہو جائے لیکن یہ جنس بہت نایاب ہے، اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

بس میرے بھائیو! میرے نزدیک مدرسہ کا صرف ایک کام ہے کہ وہ ایسے حقانی اور ربانی علماء پیدا کرے جو صرف یہی نہیں یہ تو ان کی شان سے بہت بعید ہے کہ وہ اپنے ضمیر کا سودا کریں نہیں بلکہ وہ دنیا کو جو ضمیر کا سودا کر رہی ہے، اس کو سرزنش کر سکیں، اس سے کہہ سکیں کہ انسان کا ضمیر

اس سے بہت زیادہ قیمتی ہے کہ وہ روز بکے روز نیلام پر چڑھے ایک عہدے پر بک جائے ایک عہدہ ایک کرسی، ایک خوشنودی، ایک تبسم اس کو خرید لے۔

حضرات! آپ نے انہی ریاستوں میں اپنے انہی مرکزوں میں ایسے قصے سنے ہوں گے کہ لوگوں نے اپنی شرافت پر آنچ نہیں آنے دی، اپنی عزت پر میل نہیں آنے دیا، بڑے سے بڑے نقصان کو گوارہ کرلیا، لیکن اس کے لئے تیار نہیں، وہ یہ کہ اپنی اس عزت، اس سطح اور اس معیار سے نیچے اتر آئیں، میں صرف ہندوستان کو نہیں کہتا، میری نگاہ ساری دنیا پر ہے، میں ساری دنیا کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں، اور یہ میں جو آپ کے سامنے کہہ رہا ہوں یہ میں ہر جگہ کہہ آیا ہوں، یہ نہیں کہ میں آج آپ کے سامنے پہلی مرتبہ کہہ رہا ہوں، میں نے عربوں کے سامنے یہی بات کہی، میں نے ان سے کہا کہ ہم نے، تم سے خودداری کا سبق سیکھا تھا، ہم نے تم سے ایمان کا سبق سیکھا تھا، ہم نے تم سے استقامت کا سبق سیکھا تھا، میں نے ناصر کے زمانہ میں جب عرب اپنے آپے میں نہیں تھے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ان میں باقی نہیں رہی تھی، اس وقت میں نے ان کا گریبان پکڑ پکڑ کر ان سے کہا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ ایک چیز کو غلط سمجھتے ہیں، اور آپ اس کے پیچھے اس طرح دیوانہ وار دوڑ رہے ہیں۔

عالم ہر زمانہ میں، ہر جگہ قبلہ نما رہے

مدرسہ کا کام یہ ہے کہ وہ ایسے باضمیر، باعقیدہ، ایسے باایمان، ایسے باحوصلہ ایسے باہمت فضلاء پیدا کرے کہ جو اس ضمیر فروشی، اصول فروشی اور اخلاق فروشی کے دور میں روشنی کے مینار کی طرح قائم رہیں کہ وہ کہیں نہیں جاتا اپنی جگہ پر کھڑا ہے، راستہ بتاتا ہے جیسے قبلہ نما کہ آپ کہیں ہوں وہ آپ کو قبلہ بتاوے گا، ہندوستان میں بتائے گا، دوسرے ملک میں بتائے گا، پہاڑ پر رکھیں تو بتائے گا پل پر رکھیں تو بتائے گا، یہ عالم کا کام ہے کہ ہر زمانہ میں ہر جگہ قبلہ نما رہے۔

یہ جامعۂ ہدایت جہاں تک میں سمجھتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ان مقاصد عالیہ پر ان کی بنیاد رکھی جا رہی ہے اور حقیقت میں ہر دینی مدرسہ کی بنیاد اسی پر رکھی گئی ہے اور یہی اس کی اصل قدر و قیمت ہے، ان کو آپ ان کی عمارتوں سے نہ پہچانئے، آپ ان کے بوریوں اور وہاں کے فرنیچر کی کمی اور وہاں کے پڑھنے والوں اور پڑھانے والوں کی تہی دامنی اور ان کی بے بضاعتی سے ان کا درجہ قائم نہ کیجئے، جیسے کہ کہنے والوں نے کہا گدائے شاہی میں اور دلق فقیری میں وہ شاہانہ مزاج رکھتے ہیں، ان کا مزاج شاہانہ ہے، اور ان کا لباس فقیرانہ ہے، یہ ہمارے علماء سلف تھے، اور آج انہی علماء سلف کی اس وقت ضرورت ہے۔

مدرسوں نے ہوا کے رخ پر چلنا قبول نہیں کیا

خدا کا شکر ہے کہ ہوا کے رخ پر چلنا مدرسہ کا اصول نہیں ہے اگر مدرسہ کا یہ اصول ہوتا تو وہ کب کے انگریزی کے، عربی کے کالج بن چکے ہوتے، لیکن جو اس وقت چند گنے چنے مدرسے باقی ہیں، وہ اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ مدرسوں نے ہوا کے رخ پر چلنے کو قبول نہیں کیا۔

حضرات! میں ان الفاظ کے ساتھ آپ حضرات کی عزت افزائی کا اور بانیان مدرسہ خاص طور پر حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب اور مولانا عبدالحی صاحب فائز کی ذرہ نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اس اہم اور مقدس اور اس بابرکت اور عالی مرتبہ کام کے لئے مجھ جیسے طالب علم کا انتخاب کیا، جو کچھ میرے متعلق کہا میں اللہ سے دعا کرتا ہوں آپ بھی دعا کیجئے کہ اس دن مجھے رسوائی سے بچائے کہ جس دن ﴿يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ﴾ کا ظہور ہوگا، اب میں ان الفاظ کے ساتھ اپنی گذارش کو ختم کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ اس جامعہ کو ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھے اور صحیح معنی میں اس کو مرکز ہدایت بنائے۔ آمین